ہزار برس کے راز

اسرار ہزار سالہ کا اردو ترجمہ



مولف: علی اکبر حکمی زاده

وجدان پبلشرز

مقدمہ

جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ہمارے دینی پیشواؤں نے اب تک جو کچھ کہا اور لکھا ہے، وہ یک طرفہ طور پر قاضی کے سامنے پیش کیا گیا ہے؛ جبکہ دوسروں میں یا تو اس کے مقابل کچھ کہنے کی جرأت نہیں رہی، یا انہیں مناسب اطلاع و آگاہی حاصل نہیں تھی۔ اور اگر کبھی کبھار کوئی درد مند اور باخبر شخص سامنے آیا اور اس نے کچھ کہنا چاہا تو جس طرح سے بھی ممکن ہوا، اس کی آواز دبا دی گئی۔ حالانکہ اگر کوئی شخص واقعی اپنے موقف پر اعتماد رکھتا ہو تو وہ نہ صرف کسی حریف کے سامنے آنے سے نہیں گھبراتا بلکہ خود اس کی تلاش میں رہتا ہے؛ کیونکہ ایک پہلوان خواہ صدیوں تک خالی میدان میں رجز خوانی کرتا رہے یا لاکھوں کتابیں رجز خوانی سے بھر دے، جب تک وہ کسی حریف سے آمنے سامنے نہ ہو، دوسرے لوگ صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے کہ وہ درحقیقت کس پایے کا ہے۔

اب میں یہ کہتا ہوں کہ جس چیز کو تم نے دین کا نام دے رکھا ہے، اس کا پچانوے فیصد گمراہی ہے، اور میں اس کے اثبات کے لیے بھی تیار ہوں؛ لیکن جیسا کہ کہا گیا، ایک مدعی خواہ کتنا ہی درست کیوں نہ ہو، جب تک وہ اپنا مکالمہ فریقِ مقابل کے ساتھ ایک ہی جگہ مکمل نہ کر لے، تو بڑے سے بڑے دقیق قاضی بھی صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے، چہ جائیکہ عام

لوگ۔ اب اگر تم واقعی اپنے دعووں پر اعتماد رکھتے ہو تو آؤ، اس گفتگو کو ایک کتاب میں مکمل کریں اور اسے عوام کے فیصلے پر چھوڑ دیں۔ ممکن ہے تم یہ فرماؤ کہ ہمارے پاس کوئی اختیار اور اقتدار ہے، اور جسے کچھ کہنا ہو وہ خود جا کر اسے ثابت کرے؛ لیکن یہ جان لینا چاہیے کہ وہ مضبوط بند، جو عوام کے افکار کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا اور جس کی پناہ میں تم بھی تھے، اب ٹوٹ چکا ہے، اور اب دلیل و منطق کے سوا کوئی چیز اس کے سامنے بند نہیں باندھ سکتی۔ اگر تمہارے پاس دلیل ہے تو بہت بہتر، ورنہ اب خاموشی، تکفیر، یا فاسد العقیدہ قرار دینے، اور استکانِ آب کھینچ لینے سے عوام کے جذبات کے سیلاب کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا۔

اب یا تو جواب دو، یا استعفا۔

حکمی زادہ

یہ سب ہماری اپنی ہی کرتوت کا نتیجہ ہے

کوئی ایک فرد ہو یا کوئی پوری قوم، وہ اسی وقت کسی منزل تک پہنچ سکتی ہے جب اس کا راستہ روشن اور اس کا مقصد متعین ہو۔ لیکن وہ لوگ جو ایک طرف قانون بناتے ہیں اور دوسری طرف کہتے ہیں کہ یہی قوانین بدعت ہیں؛ جو ایک طرف کہتے ہیں کہ سرکاری مال اور بینک کا پیسہ حرام ہے اور دوسری طرف اسی مال کے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے ہیں؛ وہ تودہ جو ایک طرف کہتا ہے کہ قانون سازی اور فتویٰ دینے کا حق صرف مجتہد کو ہے اور دوسری طرف یہ بھی کہتا ہے کہ ایسے لوگوں کو ووٹ دینا واجب ہے جو مجتہد کی موجودگی کے باوجود قانون بناتے ہیں—ایسا تودہ کبھی کسی منزل تک نہیں پہنچ سکتا؛ اور نہیں پہنچے گا، جب تک ہمارا راستہ یہی اور ہماری حالت ایسی ہی رہے۔

ہمارے بہت سے لکھنے والے اس لیے کہ عوام کو اپنے سے ناراض نہ کریں اور ان کے اخبار کے انتخاب یا فروخت کی راہ میں رکاوٹ نہ آئے، جب بھی تودہ میں کوئی نقص دیکھتے ہیں، اس کا سارا الزام حکومت کے سر ڈال دیتے ہیں؛ حالانکہ حکومت خود عوام کے سوا کچھ نہیں۔ اگر عوام سچے دل سے کسی چیز کو چاہیں تو حکومت کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ رضا شاہ

اپنی تمام تر قوت اور اثر و نفوذ کے باوجود ایران سے ایک رکاوٹ بننے والی چادر کو ہٹانا چاہتا تھا، مگر وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا؛ تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ موجودہ حکومت عوام کی—اور وہ بھی اصلاح کی خواہش رکھنے والی—ارادے کے مقابل کھڑی ہو سکے؟ یہ سب لوگ دفتری رشوت خوری پر چیخ و پکار کرتے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہی لوگ جب کسی دفتر میں جاتے ہیں تو متعلقہ ملازم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اشاروں کنایوں میں یہ سمجھا دیتے ہیں کہ ہم "حق و حساب" دینے کے لیے تیار ہیں۔ یہ سب سرکاری ملازمین کی فرض ناشناسی کی شکایت کرتے ہیں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی افسر اپنے ماتحتوں سے فرض کی ادائیگی پر اصرار کرے تو اسے بد خلق، عوام دشمن یا خشک مزاج کہا جاتا ہے۔

ہم کسی ملازم، کسی افسر یا کسی کمانڈر کو اسی وقت اچھا سمجھتے ہیں جب وہ آنکھیں بند کر لے اور دوسروں کی غلطیوں کو نظر انداز کرے؛ ہم کسی تاجر کو اسی وقت اچھا جانتے ہیں جب اس کے سر پر عرقچین ہو، ہاتھ میں تسبیح ہو اور بدن پر لمبا لباس ہو، اور اس کے دوسرے معاملات سے ہمیں کوئی غرض نہ ہو؛ ہم کسی ملا کو اسی وقت اچھا مانتے ہیں جب وہ خود کو شاہ سیم (قدامت پرستی) سے جوڑے رکھے اور ہر نئی چیز کی مخالفت کرے؛ ہم کسی اخبار کو اسی وقت اچھا سمجھتے ہیں جب وہ جتنا ہو سکے، حق یا ناحق، بدگوئی کرتا رہے۔

اے ایرانیو! تعارف اور لیپاپوتی سے کام درست نہیں ہوتے؛ جب تک ہم ایسے ہی ہیں، ہماری حالت بھی یہی رہے گی۔

6 سوالات

1. کیا رضاشاہ کے زمانے میں ایرانی زیادہ آسودہ حال تھے یا اس سے پہلے؟

2. کیا ایران کا انتظامی اور سرکاری نظام رضاشاہ نے بگاڑا، یا یہ پہلے ہی سے خراب تھا؟

3. کیا رضاشاہ کی جانب سے انتخابات کے امور میں مداخلت بجا تھی یا ناجائز؟

4. موجودہ دور میں تقویٰ اور ایمان کی اس کمزوری کا سبب رضاشاہ تھا، یا اس کی کوئی اور وجہ تھی؟

5. کیا رضاشاہ کے لیے اتحادی طاقتوں کے مقابل ڈٹ کر کھڑا ہونا اور جنگ کرنا بہتر تھا، یا مزاحمت ترک کر دینا؟

6. رضاشاہ، اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ، مجموعی طور پر کس نوعیت کا بادشاہ تھا؟

خدا کے نام سے

ہزار برس سے زیادہ عرصے سے ہمارے دینی پیشواؤں اور حکمرانوں نے دین کو یا تو ایک کھیل بنا رکھا ہے، یا اپنے سیاسی اور ذاتی مقاصد کو آگے بڑھانے کا ذریعہ۔ اسی وجہ سے وہ دین جو آج ہمارے ہاتھ آیا ہے، ایک شلے قلمکار آش کی صورت اختیار کر چکا ہے، جس کی ہر چیز کہیں سے آئی ہوئی ہے، اور دین کے نام پر اس میں صرف نام ہی باقی رہ گیا ہے۔ توحید اور تقویٰ، جو دین کی اصل حقیقت ہیں، مٹ چکے ہیں؛ ان کی جگہ شخص پرستی اور جھوٹ گھڑنے نے لے لی ہے۔ وہ دین جو خود ایک الٰہی رہنما تھا، آج خدا اور زندگی کے راستے میں رکاوٹ بن گیا ہے، اور یہی راستے کی عدم موجودگی ان بے شمار پگڈنڈیوں کے پیدا ہونے کا سبب بنی ہے۔

آخر کیا ہوا کہ اسلام نے صرف نصف صدی میں آدھی دنیا کو مسخر کر لیا، لیکن تیرہ صدیوں میں مسلسل زوال اور اختلاف کا شکار ہوتا گیا، یہاں تک کہ موجودہ حالت تک پہنچ گیا؟ کیوں جب ہم آج کی دنیا کے انہی ممالک پر نگاہ ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہر قوم جتنی زیادہ دیندار نظر آتی ہے، اسی نسبت سے اس کی عملی زندگی اتنی ہی پسماندہ ہوتی ہے؟ اس کی کوئی وجہ اس کے سوا نہیں کہ دین ہر جگہ اپنی اصل حقیقت کھو چکا ہے اور

اب پیشواؤں کے لیے ایک دکان اور لوگوں کو دھوکا دینے کا ایک آلہ بن گیا ہے۔ اب اگر ہم واقعی دین کی خدمت کرنا چاہتے ہیں تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ پہلے ان جھوٹوں اور ہزار سالہ کوڑے کرکٹ کو راستے سے ہٹا دیں تاکہ راہ روشن ہو جائے؛ ورنہ ان ٹھنڈی، کھوکھلی اور حقیقت سے خالی تبلیغوں کے ساتھ لوگ ایسے دین کی طرف مائل نہیں ہوں گے؛ اور اگر مائل ہو بھی جائیں تو، انھی پہلے والوں کی طرح، وہ بھی محض فائدہ اٹھانے اور عوام کو فریب دینے کے لیے ہوگا؛ اور اگر واقعی پابند ہو جائیں تو، انھی موجودہ دام میں پھنسے لوگوں کی طرح، یہ ان کے لیے—جیسا کہ آگے واضح ہوگا— مصیبت کی ابتدا بنے گا۔

یہ سچ ہے کہ ایسے لوگوں کو بیدار کرنا—جنھوں نے عقل بلکہ اپنے حواس تک کو پامال کر دیا ہے، عادت اور تقلید کے پردے آنکھوں پر ڈال رکھے ہیں— اور ایسے ڈکٹیٹروں کے مقابل ڈٹ جانا، جن کے بارے میں کسی کو یہ تک کہنے کا حق نہیں کہ تمہارا جوتا بھی جوتا ہے، نہایت دشوار کام ہے؛ مگر چارۂ کار کیا ہے؟ یہاں لاکھوں انسانوں کا معاملہ ہے، اور وہ بھی طویل زمانوں کے لیے۔ اس سے بہتر اور کیا کام ہو سکتا ہے کہ ہم کوشش کریں ان بھاری زنجیروں کو توڑ ڈالیں جو لوگوں نے نادانی میں خود اپنے ہاتھ پاؤں میں ڈال رکھی ہیں۔ اگر دوسروں نے ہزار برس میں، اور اس قدر تبلیغ کے زور پر، لوگوں کو اس حال تک پہنچایا ہے، تو ہم اس کا ہزارواں حصہ بھی کر کے سو گنا آگے بڑھ سکتے

ہیں؛ کیونکہ وہ یہ سب عوام کو فریب دینے اور اقتدار حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں، جبکہ یہاں اس کے سوا کوئی مقصد نہیں کہ خیر خواہی اور حق پرستی کو آگے بڑھایا جائے؛ اور اسی وجہ سے خدا خود بھی اس کی پشت پناہی کرے گا۔

اب میں اپنی بساط کے مطابق چند اہم موضوعات کے بارے میں—جو ایرانیوں کی گرفتاریوں کا زیادہ سبب بنے ہیں—وہ سب کچھ لکھ رہا ہوں جو بہت سی کوششوں کے بعد میرے ہاتھ آیا ہے، اور امید کرتا ہوں کہ قارئین بھی اسے حق کی تلاش کے جذبے کے ساتھ پڑھیں گے؛ اگر اس میں کوئی نقص دیکھیں تو اس کی نشاندہی کریں، اور اگر نہیں تو جس طریقے کو مناسب سمجھیں، اس مقصد کی پیش رفت کے لیے کوشش کریں۔

موضوع اول: خدا

ہمارا موجودہ دین یہ کہتا ہے کہ خدا ایک ہے، لیکن عملی طور پر اس نے خود کو شرک سے بھی بالاتر رکھ دیا ہے۔ خدا کا نام تو دیا گیا ہے، لیکن اس کے اختیارات اماموں اور امامزادگان میں، ان کی شہرت کے مطابق بانٹ دیے گئے ہیں۔ اگر کوئی خدا کے بارے میں کسی بھی قسم کی گستاخی کرے، تو ہم نے کسی کو اسے روکنے کے لیے نہیں دیکھا۔ خیام اور دیگر نے جو اتنی گستاخیاں کیں، وہ پھر بھی فلسفی اور بڑے شخصیتیں ہیں، اور ان کی کتابیں بھی آپ جانتے ہیں کہ کہاں تک پہنچی ہیں۔ لیکن اگر کوئی کہے کہ گنبد پرستی بھی وہی بت پرستی ہے جس کے خلاف اسلام نے جدوجہد کی، تو فوراً کہا جاتا ہے کہ اس کا عقیدہ فاسد اور فکر زہریلا ہے۔

زیارتِ جامعہ کبیرہ میں، جو مجلسی کے مطابق بہترین زیارات میں شمار ہوتی ہے، متن، سند، فصاحت اور معجزات کے لحاظ سے بیان کی گئی ہے، آپ پڑھتے ہیں:

"من أراد الله بدأ بکم، و من قصده توجه إلیکم، بکم فتح الله و بکم یختتم الله ... و بکم ینزل الله الغیث من السماء ..."

اگر یہ شرک نہیں، تو دنیا میں اور کوئی شرک باقی نہیں ہوگا۔

کتابِ کافی، جو چار معتبر شیعی کتب میں سے ایک ہے، میں لکھا ہے: "خدا نے عالم کو پیدا کیا اور اس کا اختیار محمد، علی اور فاطمہ کو سونپ دیا"۔ لیکن بعد میں—جیسا کہ آپ جانتے ہیں—اس میں اضافے کیے گئے، یہاں تک کہ آج تقریباً ہر شہر یا گاؤں میں ایک یا کئی بت خانہ قائم ہیں۔

شاید آپ کہیں کہ یہ سب بت پرستی نہیں ہے؛ میں کہتا ہوں کہ پہلے بت پرستی کی تعریف کیجیے تاکہ گفتگو اپنے انجام کو پہنچے۔ قرآن کہتا ہے: "**وہ لوگ جنھوں نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا لیا ہے، کہتے ہیں: ہم ان کی عبادت اس لیے نہیں کرتے مگر اس لیے کہ وہ ہمیں خدا کے قریب کر دیں**"۔ اس آیت اور اس جیسی بہت سی دوسری آیات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ **شرک** سے مراد یہ ہے کہ خدا کے کام غیرِ خدا سے، اس کے سامنے عاجزی اور فروتنی اختیار کر کے طلب کیے جائیں۔ اب اگر آپ اس معنی کو قبول کرتے ہیں تو بہت بہتر، ورنہ خود ہی اس کی تعریف بیان کیجیے تاکہ دیکھا جا سکے کہ وہ شرک کیا تھا جس کے خلاف اسلام نے تیئیس برس تک جدوجہد کی؟ آپ جو معمولی اور ضمنی مسائل میں اس قدر باریک بینی سے بحث کرتے ہیں، اس قدر بڑے موضوع کو نظرانداز کیسے کر گئے؟ قرآن اور تاریخِ اسلام کا کم و بیش نوّے فیصد حصہ شرک کے خلاف جدوجہد پر مشتمل ہے، مگر آپ نے اسے یکسر فراموش کر دیا، اور اس کے بجائے لوگوں کو ایسی باتوں میں الجھا دیا جو نہ دنیا کے کسی درد کا علاج ہیں اور نہ آخرت کے۔

مجھے واقعی ہنسی آتی ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اسلام سے وابستہ کرتے ہیں یا اس کی حمایت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اسلام کی ایک بنیادی بنیاد توحید ہے؛ آپ نے اسی توحید سے آخر کیا حاصل کیا؟ اگر کوئی مادّی شخص توحید کا دعویٰ کرے تو وہ حقیقت کے کہیں زیادہ قریب ہے؛ کیونکہ وہ پوری کائنات کو ایک ثابت اور منظم نظام کے تابع سمجھتا ہے، جبکہ آپ ہزاروں پتھروں، لکڑیوں، قبروں اور قبروں کے صاحبان کو کارساز مانتے ہیں۔

قرآن کئی مقامات پر کہتا ہے کہ پیغمبر خود غیب نہیں جانتا؛ کئی مقامات پر یہ کہتا ہے کہ وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہے، بس اسے وحی کی خبر دی جاتی ہے؛ اور یہ بھی کہتا ہے کہ وہ اپنے فائدے اور نقصان کا مالک نہیں ہے۔ لیکن آپ امامزادہ داود کے لیے بھی یہ سچائیاں قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

ابنِ مکتم، جو پیغمبر کے خاص صحابہ میں سے تھے، اندھے تھے؛ نہ انہوں نے اپنی بینائی پیغمبر سے طلب کی، اور نہ پیغمبر نے ایسا کچھ کیا۔ عقیل، علی کے بھائی، اندھے تھے؛ نہ اس نے اپنے بھائی سے کسی حاجت کے لیے مدد مانگی، اور نہ اس نے عقیل کو کسی حاجت کے لیے پہنچایا۔ لیکن آپ کہتے ہیں کہ امام کی تربت **"ہر درد کا علاج اور ہر بلا سے نجات ہے"۔**

نہ، سچ میں! اگر آپ اس بات کو مذاق کے طور پر کہتے ہیں، تو دینِ خدا اور انسانوں کی جان مذاق بردار نہیں ہے؛ اور اگر سنجیدگی سے کہتے ہیں، تو پھر کیوں تاخیر کر رہے ہیں؟ کہہ دیجیے کہ یہ سب ہسپتال، دواخانے اور طب و فارماسوٹیکل کے ادارے بند کر دیے جائیں۔ اگر کہیں کہ یہ عقیدہ ضروری ہے، تو اس کا حل بھی آسان ہے: آپ خود جو عقیدہ رکھتے ہیں، سب سے پہلے اس عمل کو اپنے بارے میں کریں؛ اور جب دوسرے لوگ یہ دیکھیں گے تو انہیں بھی یقین ہو جائے گا۔ نتیجتاً، نہ صرف عوام ایمان لائیں گے بلکہ دنیا بھی ان بیماریوں اور ان خرچوں سے آزاد ہو جائے گی۔

آپ خود کہتے ہیں کہ کسی کے لیے قبر تعمیر نہیں کی جانی چاہیے؛ جیسا کہ اسی کتاب **کافی** میں رسولِ خدا اور ائمہ سے متعدد احادیث نقل ہوئی ہیں جن میں وصیت کی گئی ہے کہ ہماری قبروں کو زمین سے چار انگلیوں کے برابر اونچا رکھا جائے، اور بعض روایتوں میں آیا ہے کہ چار انگلیوں کے برابر اونچا کر کے اس پر پانی چھڑک دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ چار انگلیوں کی بلندی بھی اسی لیے ہے کہ پانی ڈالنے اور وقت گزرنے کے بعد قبر زمین کے برابر ہو جائے۔ چنانچہ ایک اور جگہ آیا ہے کہ پیغمبر اور صحابہ کی قبریں زمین کے برابر تھیں۔ اسی طرح یہ حدیث بھی متعدد مقامات پر نقل ہوئی ہے کہ علیؑ نے فرمایا:

"میں تمہیں اس چیز کا حکم دیتا ہوں جس کا حکم مجھے پیغمبر نے دیا تھا: جو قبر بھی زمین سے اونچی دیکھو، اسے زمین کے برابر کر دو، اور جو مجسمہ دیکھو، اسے مٹا دو۔"

اب سوال یہ ہے کہ ایسے واضح احکامات کے ہوتے ہوئے—جن میں سے بعض یہاں ذکر کیے گئے—آپ خود کو یہ اجازت کیسے دیتے ہیں کہ اتنے گنبد اور بارگاہیں تعمیر کی جائیں؟

کہتے ہیں: دین کے بزرگ کسی گمنام سپاہی یا فردوسی سے کم نہیں؛ تو پھر دوسروں کی قبریں کیوں بنائی جاتی ہیں؟ میں کہتا ہوں: آپ تو دوسروں کی تقلید کے پابند نہیں ہیں؛ وہ جو چاہیں کریں۔ آپ ان تمام ممانعتوں کا کیا کریں گے جو اس بارے میں وارد ہوئی ہیں؟ اس کے علاوہ، احترام اور عبادت میں فرق ہے؛ آپ قبر کو **بابُ الحوائج** کہتے ہیں، اس کے لیے **زیارتِ جامعہ کبیرہ**—جو سراسر شرک ہے—پڑھتے ہیں، آپ قبر کی مٹی پر سجدہ کرتے ہیں؛ پھر بھی اپنے عمل کو دوسروں کے عمل کے برابر کیسے ٹھہرا سکتے ہیں؟

آپ کہتے ہیں کہ اگر کسی کو شہر کے حکمران سے کام لینا ہو تو پہلے دربان سے ملنا پڑتا ہے۔ تو کیا عالم کا خدا کسی حکمران سے کم نہیں؟ میں کہتا ہوں: آپ کی غلطی یہی ہے کہ آپ خدا کو ایسے سمجھتے ہیں جیسے وہ کسی بادشاہ کی طرح ہے جو خود اپنے کام نہیں دیکھ سکتا اور مجبوراً وزیر رکھتا ہے؛ یا جیسے وہ آخوند ہے جو شاگرد کو شدت سے مارتا ہے مگر کوئی ثالث آئے تب کام بنتا ہے۔ **تَعَالَى اللهُ عَمَّا يَقُولُ الظَّالِمُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا**۔

ہمارا موجودہ دین کہتا ہے کہ دین کا دوسرا اصول عدل ہے؛ لیکن ہم جیسے ان "گندم نما جوفروش" کو خدا کی حقیقی صورت میں دیکھتے ہیں، وہ بہت ستمگر اور ان کے کام بہت بچگانہ لگتے ہیں۔ کیونکہ یہ خدا کبھی گھاس کو پہاڑ دیتا ہے اور کبھی پہاڑ کو گھاس؛ یہ خدا قیمت کے حساب سے نہیں دیتا بلکہ بہانے کے مطابق دیتا ہے؛ یہ ایک ایسا خدا ہے جو ہر دم بدلتا ہے، آج فیصلہ کرتا ہے اور کل اپنے فیصلے سے پلٹ جاتا ہے۔

کتاب **کافی** میں صحیح سند کے ساتھ آیا ہے کہ خدا نے قیامِ قائم کو سنہ 70 ہجری میں مقرر کیا تھا، لیکن جب لوگوں نے امام حسینؑ کو قتل کر دیا تو خدا نے زمین والوں پر غضب کیا اور اسے سنہ 140 ہجری تک مؤخر کر دیا۔ اور جب ہم نے یہ بات آپ کو بتائی اور آپ نے عوام کو بھی بتا دی، تو پھر خدا نے اس کام کے لیے وقت ہمارے پاس نہیں رکھا۔

ایک اور مقام پر ہے کہ امام جعفر صادقؑ نے اسماعیل کو اپنا جانشین مقرر کیا؛ لیکن جب اسماعیل سے کچھ ایسا ہوا جو امام کو پسند نہ آیا، تو انہوں نے اپنا جانشین موسی مقرر کیا۔ جب اس تبدیلی کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا کہ اسماعیل کے بارے میں "بَداء" ہوا۔

سچ یہ ہے کہ اگر خدا ایسی ہی صفات والا ہو، تو پھر ہر بے سروپائی حق رکھتا ہے کہ خدا ہونے کا دعویٰ کرے۔

یہ خدا ایک مجلسِ عزا یا ایک زیارت کے بدلے ہزار شہیدوں کا ثواب دیتا ہے، اور ایک روایت کے مطابق ایک لاکھ شہیدوں کا، اور ایک اور روایت کے مطابق ہزار ہزار (یعنی دس لاکھ) شہیدوں کا ثواب۔ سچ یہ ہے کہ اگر خدا واقعی ایسا ہی ہو جیسا ہم نے اسے پہچانا ہے، تو بدر و اُحد کے شہداء کتنے بدقسمت تھے کہ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ اس خدا کا نظام تو محض بچوں کا کھیل ہے، اور انہوں نے بلاوجہ اپنی قیمتی جانیں قربان کر دیں؛ اور ہم کتنے خوش نصیب ہیں کہ ہم نے ایسے خدا کو پہچان لیا، اور نتیجتاً آرام سے کھاتے پیتے اور سوتے ہیں، اور ایک زیارت کے ذریعے بدر کے ہزار شہیدوں کا ثواب سمیٹ لیتے ہیں۔ واہ اس ہاتھ کی صفائی پر کہ دنیا کے بڑے بڑے شعبدہ باز بھی آپ کے سامنے "ای واللہ" کہنے پر مجبور ہو جائیں؛ کیونکہ وہ تو صرف آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، جبکہ آپ آنکھوں کے ساتھ عقل پر بھی پردہ ڈال دیتے ہیں۔

اس گفتار میں ایک اور موضوع جسے واضح ہونا چاہیے، **استخارہ اور غیب گوئی** ہے، جو ہمارے لیے ایک بڑی مصیبت بن چکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ: کیا استخارہ واقعی ہماری رہنمائی کرتا ہے یا نہیں؟ اگر آپ کہیں کہ کرتا ہے، تو یہ درست نہیں؛ کیونکہ اگر واقعی ہمارا خدا سے ایسا تعلق ہوتا کہ ہمیں معلوم ہو جائے کب مال خریدنا ہے، کب بیچنا ہے، کب دشمن پر حملہ کرنا ہے اور کب رک جانا ہے، تو ہم اسی ذریعے سے پوری دنیا پر مالی اور سیاسی بالادستی حاصل کر سکتے تھے۔ مثال کے طور پر

موسولینی (اسلام کا حامی) اگر چند برس جنگ کرنے اور اتنے جانی و مالی نقصانات اٹھانے کے بعد یہ جاننے کے بجائے کہ اسے شکست ہوگی، ایک بار تسبیح یا قرآن سے استخارہ کر لیتا، تو وہی نتیجہ بغیر ان تمام نقصانات کے حاصل کر لیتا۔ اس سے بھی قریب کی مثال قفقاز کی جنگ ہے، جو خود علما کے حکم اور شرکت سے لڑی گئی اور جس کا انجام ایران کی شکست پر ہوا۔ بہتر یہ تھا کہ پہلے استخارہ کر لیا جاتا، تاکہ ایران پر یہ ساری تباہی اور رسوائی نہ آتی۔

اور اگر آپ کہیں کہ استخارہ حقیقت نہیں بتاتا، تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے: آخر کیوں لوگوں کو دھوکہ دیا جاتا ہے؟ کیوں خدا کے نام، اور لوگوں کی جان و مال کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے؟ ایک لڑکی کو کسی نوجوان کے ساتھ شادی کے لیے پسند کیا جاتا ہے؛ پھر بات چیت کے بعد یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ خدا سے مشورہ لیا جائے؛ بیچ جوڑے میں آ جاتے ہیں؛ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں کو لمبے عرصے تک انتظار کرنا پڑتا ہے کہ ہر ایک کے لیے مناسب شریک حیات کب ملے۔ ایک نے پیسہ جمع کیا اور کسی گھر کو اپنی زندگی اور رقم کے مطابق مناسب سمجھا، لیکن استخارہ منفی نکلتا ہے؛ ایک گھر سے محروم رہ جاتا ہے اور دوسرا اپنی جمع پونجی کھو دیتا ہے۔ خدا جانتا ہے کہ اسی استخارہ سے ہمیں کتنے بھاری نقصان پہنچے ہیں، اور یہ لوگ اپنی خاص چالاکی سے سب کچھ چھپا دیتے ہیں۔

اور غیب گوئی یا اس جیسی کوئی بھی کارروائی، اگر دین کے راستے سے ہو تو اس میں کوئی شک نہیں کہ پیغمبروں کے نزدیک کسی کو خدا کے قریب نہیں پہنچا، اور آپ دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے قرآن کے متعدد مقامات پر خود کو اس کام سے دور رکھا۔ اور اگر یہ علم اور قدرتی قوانین کے راستے سے ہو، تو اس میں بھی کوئی مقابلہ نہیں، کیونکہ یورپی لوگ اس میدان میں سب سے آگے ہیں، اور آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اس قسم کے دعوے نہیں کرتے۔ لیکن ہم ان سب باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ **وقوع** سے بہتر کوئی دلیل نہیں۔ اگر آپ کے پاس غیب گوئی یا عمومی طور پر کوئی ایسا کام موجود ہے جو فطرت کے قوانین سے ماورا ہو—چاہے آپ کے پاس ہو یا کسی اور کے پاس—تو آئیے، میرے خرچ پر علماء کو مدعو کیجیے اور ایک مجلس منعقد کیجیے تاکہ ان کے سامنے اپنے اس عمل کو دکھائیں۔ ہم بھی اسے ہر جگہ عام کر دیں گے، تاکہ جو لوگ ایران اور ہندوستان کو خرافات کا گہوارہ کہتے ہیں، وہ جان لیں کہ یہاں مردانِ خدا کا مسکن ہے۔

آپ کہتے ہیں:

"جسے حق کے اسرار سکھائے گئے، اس کے منہ پر مہر لگا دی گئی اور اس کی زبان سی دی گئی۔"

میں کہتا ہوں: یہ کیسے اسرار ہیں کہ آپ کو حق حاصل ہے انہیں سادہ لوح اور ان پڑھ لوگوں کو بتائیں اور دکھائیں، لیکن جب باریک بین اور جستجو کرنے والے لوگ سامنے آتے ہیں تو وہی باتیں اچانک "اسرار" بن جاتی ہیں؟ اگر واقعی یہ راز ہیں تو کسی کو بھی نہیں بتانے چاہییں؛ اور اگر راز نہیں ہیں تو کم از کم ایک بار انہیں ایسی ہی کسی مجلس میں کھول کر دکھا دیجیے۔

عقل کی داوری یا کلام کا نتیجہ:

انسان ہر چیز کے پیچھے جاتا ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے مقصد کو سب سے قریبی راستے سے حاصل کرے۔ اسی لیے جب اس نے اس دنیا کو دیکھا اور اس کے خالق کی تلاش میں لگا، تو اس میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اسے اسی مادی دنیا میں ہی پائے۔ نتیجتاً کچھ لوگ مادّی ہو گئے اور کچھ لوگ بت پرست؛ فرق یہ تھا کہ پہلا گروہ راستے پر چلتے ہوئے نتیجے میں غلط ہو گیا، لیکن بت پرست ابتدا ہی سے راستہ بھٹک گئے۔ پھر پیغمبر آئے اور لوگوں کو اصل مقصد کی طرف رہنمائی کی، لیکن کچھ ہی دیر بعد لوگ دوبارہ ہندوستان کی طرف یادیں لے گئے اور کہا: "ہم پیغمبروں کے خدا کو نہ آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں، نہ ہاتھ سے، نہ ذہن میں؛ اور ان کے اقوال کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتے، تو ہم کہتے ہیں کہ پیغمبروں کا خدا ان کا ہے اور وہ خود ہمارے ہیں، تاکہ ہم ان کی قبروں کے اردگرد کھڑکیاں بنائیں اور ان کے ساتھ تعلق قائم کریں۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم انہیں اپنے ذہن میں موجود کر لیں۔"

لیکن یہ جاننا ضروری ہے کہ اگر انسان سب کچھ اپنی خواہش کے مطابق کر لے، تو خدا بنانے کا اختیار اس کے پاس نہیں ہوتا۔ آپ بہت چاہتے ہیں کہ موم بتی جلانے، بھیڑ قربان کرنے، گنبد اور بارگاہ تعمیر کرنے سے اپنی حاجتیں پوری ہوں؛ لیکن خدا نے کائنات کو ایک مستحکم اور کامل نظام پر قائم کیا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ یہ سب بچگانہ اعمال اسے بدل سکیں۔

لہٰذا یہ کہنا چاہیے کہ جو کوئی خدائی کام کا دعویٰ کرے—یعنی ایسا عمل انجام دے جو انسانی طاقت سے باہر ہو—وہ جھوٹا ہے، بلکہ کلاہ بردار اور راہزن سے بھی بدتر ہے؛ اور اسے عوام کی آنکھوں کے سامنے سزا دی جانی چاہیے، تاکہ پھر کوئی شخص خدا کے نام کو روزی کمانے یا منصب حاصل کرنے کا ذریعہ بنانے کی ہوس نہ کرے۔ اور اگر یہ ممکن نہ ہو، تو کم از کم ایک باشعور قوم کو چاہیے کہ ایسے لوگوں کو حقیر سمجھے؛ اور اگر یہ بھی نہ کرے، تو وہ قوم خود فطرت کے حکم کے مطابق—جو خود خدا کا حکم ہے—سزا کی مستحق قرار پاتی ہے، اور دیر یا بدیر نابود ہو جائے گی۔

بہانے

جب بھی کسی خرافات کو کنار کرنے کی بات آتی ہے، وہ لوگ جو ان سے دل نہیں ہٹا سکتے اور جن کے پاس درست جواب نہیں ہوتا، مجبوراً دوسرے دروازوں سے داخل ہوتے ہیں۔ انہیں بھی واضح کرنا ضروری

ہے تاکہ ہر قدم پر ایسے اعتراضات کا سامنا نہ ہو:

1. کہتے ہیں کہ ان باتوں کے بجائے لوگوں کے لیے صرف خوراک اور ضروریاتِ زندگی کے بارے میں سوچنا بہتر ہے؛

2. یہ باتیں اختلاف اور نفاق پیدا کرتی ہیں اور آج کے حالات کے لیے مناسب نہیں ہیں؛

3. یہ باتیں شہرت حاصل کرنے کے لیے ہیں؛

4. یہ باتیں غیر ملکیوں (بیگانگان) کو بھڑکانے کا باعث ہیں؛

5. کیسے ہوا کہ اتنے علماء اور بزرگ سمجھ نہ پائے اور آپ سمجھ گئے؟

6. کہتے ہیں: اب ہم نے یہ سب غلط مان لیا اور کنارے رکھ دیا، تو اب ان کی جگہ کیا رکھیں؟ اگر ہم ہر ایک بات پر گفتگو کریں تو یہ بہت لمبا ہو جائے گا، لیکن ان سب کا ایک مشترک جواب ہے، جس پر ہم اکتفا کرتے ہیں:
جس راستے پر یہ عوام گامزن ہیں، اگر یہ کتاب کہتی ہے کہ غلط ہے، تو بلاشبہ غلط راستے پر نہیں جانا چاہیے، اور باقی گفتگو سب فضول ہے۔

اور اگر راستہ درست ہے، تو سب سے پہلے اس کو دلیل کے ساتھ واضح بیان کریں، باقی شاخ بہ شاخ جانے کی ضرورت نہیں؛

7.کہتے ہیں: انسانی عقل محدود ہے، کیونکہ دنیا میں جتنے بھی بے شمار مذاہب آئے اور موجود ہیں، سب کہتے ہیں کہ دلیل عقل کے مطابق ہے، جبکہ حقیقت میں ایک ہی وجہ ہے۔

میں کہتا ہوں: آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ دلائل واقعی عقل کے دلائل ہیں، نہ کہ عادت اور تقلید کے فیصلے؟ اگر کسی دیو کو فرشتہ کہہ دیا جائے تو کیا اس کی حقیقت بھی بدل جائے گی؟ آپ نے اسی عقل کے ذریعے خدا کو پہچانا اور اسی عقل کی بنیاد پر اپنی زندگی کی عمارت کھڑی کی۔ اگر عقل کا حکم ناقص ہے تو پھر دین اور زندگی دونوں کو ایک ساتھ ترک کر دینا چاہیے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ ایک شاخ کو بچانے کے لیے جڑ ہی کاٹ دی جائے؟

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ عقل ناقص ہے، وہ خود بھی اپنی اس بات پر یقین نہیں رکھتے؛ بلکہ چونکہ وہ لوگوں کو نادانی کی طرف لے جانا چاہتے تھے اور عقل اس راستے میں رکاوٹ بنتی تھی، اس لیے مجبوراً یہ بات گھڑ لی کہ تمہاری عقل ناقص ہے اور تمہیں "عقلِ کل" کے تابع ہونا چاہیے، یعنی ہر اس جھوٹ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا چاہیے جو وہ خود

گھڑ لیتے ہیں۔ حالانکہ عقل خدا کا قریب ترین فرستادہ ہے اور انسان کے لیے آنکھ کی مانند ہے؛ جس کے بغیر اسے ایک قدم بھی اٹھانے کا حق نہیں۔

ہاں، عقل بھی آنکھ کی طرح کبھی رہنمائی کی محتاج ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود ہم خرد سے بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ دوسرے لفظوں میں، عقل کی مثال ریاضی کے قوانین جیسی ہے: ان کو سیکھنے کے لیے ہمیں استاد کی ضرورت ہوتی ہے، مگر استاد کی بات بھی ہم اسی وقت قبول کر سکتے ہیں جب وہ ہماری عقل کے مطابق ہو؛ کیونکہ اگر عقل کو بالکل الگ کر دیا جائے تو استاد کو یہ حق بھی حاصل ہو جائے گا کہ وہ کہے: ریاضی کے قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ تم اپنا آدھا مال مجھے دے دو تاکہ وہ حلال ہو جائے۔

صحیح ہے کہ انسان کا فکر خدا کے کاموں کو سمجھنے سے قاصر ہے، لیکن خدا کا کام خدا کے راستے سے الگ ہے؛ خدا کا کام صرف اپنے لیے ہے اور اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں، لیکن راستۂ خدا ہمارے لیے ہے اور ہمیں اسے دیکھنا چاہیے اور اسی پر چلنا چاہیے، نہ کہ ہم اپنی آنکھیں بند کر کے اندھے کی طرح دوسروں کے پیچھے چلیں اور جو کچھ بھی کہا جائے بس یہ کہیں: ''نادان کو عالم سے بحث نہیں۔''

عقل کی کمی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبھی لوگ کچھ اور چیزوں کو عقل کا لباس پہنا دیتے ہیں اور اسے عقل کہتے ہیں، لیکن تھوڑی سی باریکی سے آپ انہیں بھی پہچان سکتے ہیں، اور جیسا کہ آگے دیکھیں گے، یہی کام وہ دین اور یہاں تک کہ حس (حواس) کے ساتھ بھی کرتے ہیں۔

یہ چیزیں شامل ہیں: عادت، تقلید، وھم، سودجویی، اور ان کا ردعمل، لیکن سب سے اہم **عادت** ہے؛ کیونکہ بہت سی ہماری موجودہ عقائد کو عادت نے قائم رکھا ہوا ہے اور اس کا نام عقل رکھ دیا گیا ہے۔

عادت اور عقل کا تعلق الٹا ہے؛ یعنی یہ کم فہم مردوں اور عورتوں میں زیادہ مضبوط ہے، اور ایسا ہونا چاہیے؛ کیونکہ ایسے لوگ جو کچھ سنتے ہیں اسے عقل کی ترازو میں نہیں تول سکتے، ان میں عادت کو مضبوط ہونا ضروری ہے تاکہ ہر وقت کسی رنگ میں نہ ڈھل جائیں۔

عادت کبھی کبھی عقل کے ساتھ ملاپ کر لیتی ہے اور حواس پر بھی اثر ڈالتی ہے۔ میں نے خود دس سال سے زیادہ عرصے تک، ہر دن کئی بار ایسے واقعات دیکھے ہیں، یہاں تک کہ خود اس کام کا ذمہ دار اپنی غلطی کا شعور پاتا ہے اور اسے ترک کر دیتا ہے۔ بہت سے قارئین نے سنا ہوگا کہ رضاشاہ کے دور سے پہلے مشہد میں درمیانے سائز کے پتھر زیارت کے لیے آتے تھے، اور لوگ کہتے تھے کہ ہم نے یہ اپنی آنکھوں سے دیکھا

ہے، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے یہ پتھر ہاتھ سے لائے جاتے اور اسی وقت فریاد کی جاتی: "چلو دیکھو، دشمنوں کی آنکھوں میں دھول جھاڑتے ہوئے، پتھر زیارت کے لیے آگیا!" اور جیسا کہ ایک دوست نے بتایا، ڈکٹیٹر کے دور میں تو یہ پتھر بھی مختاری کی جیل سے ڈر گئے اور دوبارہ زیارت کے لیے نہیں آئے۔

اسی نوزدہویں رمضان کی رات، جب کہا جاتا تھا کہ دو لوگ آپس میں چپک گئے ہیں، جب ثبوت مانگا جاتا تو یا کہتے: "ہم نے خود دیکھا" یا کہتے: "کسی معتبر آدمی سے سنا ہے"۔ اب آپ یہاں سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ تمام معجزات جو نقل کیے جاتے ہیں، ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔

8.کہتے ہیں: یہ خرافات دنیا کے ہر کونے میں موجود ہیں اور کہیں نقصان نہیں پہنچاتے، تو پھر یہ کیا کام ہے کہ ہم بلاوجہ لوگوں کو ناراض کریں؟ میں کہتا ہوں: اگر یہ اعتراض درست بھی ہے، تو پہلے پیغمبر پر وارد ہوتا ہے، جس نے بت پرستی کے لیے اتنی خونریزی کی۔ عربستان کے لوگ خانہ کعبہ میں کچھ ٹکڑوں اور پتھروں کو بت کے نام سے رکھتے تھے، اور وہ انہیں خدا نہیں سمجھتے تھے، بلکہ خدا کے نزدیک ایک وسیلہ یا شفیع شمار کرتے تھے۔ تو پھر پیغمبر کو یہ کونسے مقام پر ضروری تھا کہ وہ اپنی بیس اور تین سالہ قیمتی زندگی صرف اسی پر ضائع کرے؟

یہ اس لیے تھا کہ پیغمبر جانتا تھا کہ انسان کی توجہ ایک قیمتی طاقت ہے، جس کے اثر سے زندگی کی تمام ترقیات ممکن ہوتی ہیں۔ اگر یہ طاقت پہاڑ تک پہنچ جائے تو اسے توڑ کر بکھیر دیتی ہے، اور اگر سمندر تک پہنچے تو اسے پھاڑ دیتی ہے۔ تو پھر اس سے بڑا نقصان کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی طاقت کو بلا مقصد صرف بت، یا علم کے درخت، یا قبر پر صرف کر دیا جائے؟

آج مشرق مغرب کے زیرِ اثر کیوں ہے؟ ہندوستان انگلینڈ سے کسی معاملے میں کم کیوں ہے، یا فن لینڈ ایران سے زیادہ کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ ان کی توجہ زیادہ کام اور کوشش پر ہے، اور ہماری توجہ خرافات پر۔ شاید آپ کہیں: خرافات اور کام و کوشش میں کیا مخالفت ہے؟ میں کہتا ہوں: یہ ایک مسلّم قانون ہے کہ ہر طاقت – جیسے ندی کا پانی – جتنی زیادہ کسی ایک سمت کی طرف مرکوز ہو، اتنی ہی کم دوسری سمت میں رہتی ہے حتیٰ کہ مکمل ختم ہو جاتی ہے:

﴿ مَا جَعَلَ ٱللَّهُ لِرَجُلٖ مِّن قَلۡبَيۡنِ فِي جَوۡفِهِۦ ﴾ [الأحزاب: 4]۔

اس بات کو چند مثالوں سے واضح کرنا ضروری ہے:
ایران میں تقریباً لاکھوں کتابیں مصائب، زیارت اور اسی طرح کے موضوعات پر چھپ چکی ہیں، یہاں تک کہ ہر گاؤں میں آپ دیکھیں گے کہ وہ دیہاتی جس نے کچھ پڑھا لکھا ہے، اس کے پاس ایک یا زیادہ ایسی کتابیں الماری میں موجود ہیں۔ لیکن اسی ملک میں اگر زراعت پر کوئی کتاب چھپتی ہے، تو خریدار بہت کم ملتے ہیں۔

اگر کوئی عورت خواب میں یا خیال میں دیکھے کہ کسی پہاڑ کے چوٹی پر کسی دلدل کے نشان قدم دیکھا ہے، تو ایک بار دیکھیں کہ ایک شہر کس طرح ہلتا ہے اور نذر کے سیلاب کے ساتھ اس کی طرف دوڑتا ہے؛ لیکن اگر ایک دستہ فوجی آپ کی جان کی حفاظت کے لیے دشمن کے سامنے لڑے اور مارے جائیں، تو ان کی آخری قدردانی صرف ایک یادگاری مجلس ہوتی ہے، اور وہ بھی وزارت جنگ کی طرف سے، نہ کہ عوام کی طرف سے۔

آپ نے اکثر ایسے لوگ دیکھے ہوں گے جو ندیوں میں کپڑے دھوتے ہیں اور ملبہ پھینکتے ہیں یا عوامی حوضوں کو گندا کرتے ہیں؛ شاید آپ سوچیں کہ یہ لوگ ناخواندہ ہیں، لیکن ایسا نہیں ہے؛ ان میں سے زیادہ تر کی تربیت مکمل ہے، لیکن کسی اور راستے پر۔ جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں، یہ لوگ کم پانی کو بھی ہاتھ نہیں لگاتے اور دوسروں کو بھی روک دیتے ہیں۔آپ نے اکثر ایسے لوگ دیکھے ہوں گے جو کھیتوں کو روندتے ہیں یا پودوں کو کھیل یا لکڑی کے لیے توڑ دیتے ہیں، اور اس بدکارانہ عمل کے نتیجے میں کتنے ہی پودے ضائع ہو جاتے ہیں، جو درخت بننے کی صلاحیت رکھتے تھے اور اب بیکار پڑے ہیں۔ شاید آپ ایسے لوگوں کو لاپروا اور بے فکر سمجھیں، لیکن ایسا نہیں ہے؛ کیونکہ جب یہ لوگ کسی زیارت گاہ سے باہر نکلتے ہیں، تو پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں کہ کہیں قبر کی بے احترامی نہ ہو جائے۔ یہی لوگ اگر زمین پر کوئی ٹکڑا روٹی دیکھیں، تو اسے اٹھاتے ہیں اور شاید وہ آلودہ روٹی بھی

کھا جاتے ہیں تاکہ خدا کی برکت سے بے احترامی نہ ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ انہیں قبر یا روٹی کے احترام کا شعور دیا گیا ہے، لیکن اصل موضوع پر کچھ نہیں بتایا گیا۔

جہاں تک یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خرافات دنیا کے ہر کونے میں ہیں، یہ بات اسی طرح ہے جیسے کہا جائے کہ بیماری ہر جگہ ہے، لہٰذا اسے چھوڑ دیا جائے۔ خرافات بھی ایک روحانی مرض ہے؛ اور جس معاشرے میں یہ زیادہ ہو، وہ اتنی ہی زندگی میں پیچھے رہتا ہے۔ اگر یقین نہیں آتا، تو ایران اور ترکی، یا چین اور جاپان، یا ہندوستان اور روس کے حالات دیکھیں۔

9. کہتے ہیں: خرافات بے لگام آزادی سے بہتر ہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خرافات پر یقین رکھنے والے لوگ دوسروں کی نسبت زیادہ درست کردار ہوتے ہیں اور ان کی خیرات و مبرّات بھی زیادہ ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں: اس بات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ گویا ہمارے پاس صرف دو ہی راستے ہیں: یا تو خرافاتی بن جائیں یا بے لگام ہو جائیں؛ حالانکہ دو اور راستے بھی موجود ہیں: اس زمانے میں خرافات کو درست ثابت کر کے برقرار رکھنا آسان تھا؛ لیکن اب لوگوں کی سوچ میں کچھ جنبش پیدا ہو گئی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ وہ پہلے کی طرح اپنے عقائد پر مضبوطی سے قائم ہیں، اور نہ ہی ان کی فکر اس قدر مضبوط ہوئی ہے کہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکیں۔ چنانچہ یہ تزلزل اُس کمزور نکتے پر جا کر اثر انداز ہوتا ہے، جہاں مادی فائدہ درمیان

میں آجاتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ خرافات ان کے فوری مفاد کے خلاف نہیں جاتیں، بلکہ الٹا ان پر پردہ ڈال دیتی ہیں، اسی لیے یہ باقی رہ گئی ہیں، اور ان کے ساتھ ساتھ یہ بے قیدی اور لجام گسیختگی بھی بڑھتی چلی گئی ہے۔ اور رہی بات ان کی خیرات و مبرّات کی—اگرچہ وہ بظاہر بہت زیادہ ہیں—لیکن ہم آگے دیکھیں گے کہ یہ کن کاموں کے لیے ہوتی ہیں اور ان کا نتیجہ آخرکار کیا نکلتا ہے۔ ایک یہ کہ نہ خرافاتی ہوں اور نہ بے لگام، بلکہ حقیقت کے پیرو ہوں۔ اس کی مثال وہی راستہ ہے جس پر صدرِ اسلام کے لوگ چلتے تھے: وہ پاکیزہ بھی تھے اور خرافات سے بھی پاک تھے۔

دوسرا یہ کہ بیک وقت خرافاتی بھی ہوں اور بے لگام بھی؛ اور یہی وہ راستہ ہے جس پر ہم آج چل رہے ہیں۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ آج کے لوگ—چاہے سرکاری ملازم ہوں، تاجر ہوں یا دکاندار—ان کے طور طریقے اور اخلاق کیسے ہیں؛ اس کے باوجود جس سے بھی بات کریں، سب اپنے آپ کو دیندار ہی کہتے ہیں۔ ایک طرف خیانت، ذخیرہ اندوزی اور اختلاس کے ذریعے پیسہ کماتے ہیں، اور دوسری طرف اسی پیسے کو مجالسِ عزا اور زیارتوں پر خرچ کرتے ہیں؛ اور اگر کچھ زیادہ مقدس مزاج ہوں تو پہلے اسے گھما پھرا کر حلال بناتے ہیں، پھر زیارت کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ستر برس کے مرد بھی چودہ برس کی لڑکیوں کی طرح آنکھ اور کان بند کیے ہوئے تھے؛ *جلاء العیون* کے سوا کوئی کتاب ان کے پاس نہ تھی، اور ''ملا'' کے سوا کسی کو عالم نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیے اگر لوگوں سے کہا جاتا کہ دہی سیاہ ہے تو وہ کہہ دیتے: خدا کی قدرت سے کیا بعید ہے؟ خصوصاً اگر اس کے بعد ایک آدھ عربی جملہ بھی لگا دیا جاتا (حدیث کے نمونے دیکھ لیجیے)۔

موضوع دوم: امامت

ہمارے آج کے دین میں امامت کو نبوت کے بعد کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن عملاً اسے اس سے کہیں بلند مقام پر فائز کر دیا گیا ہے؛ کیونکہ نہ ہم نے کبھی سنا اور نہ دیکھا کہ کسی نے نبی کے بارے میں کہا ہو کہ انہوں نے کسی اندھے کو بینا کیا یا کسی مریض کو شفا دی، اور نہ یہ دیکھا کہ کسی نے نبی کے نام کی نذر مانی ہو۔ اس کے برعکس، اماموں اور امامزادوں کے بارے میں ایسی باتیں بکثرت سنی اور دیکھی جاتی ہیں۔ خود نبی یہ کہتے ہیں کہ میں اپنے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں، مگر یہاں یہ کہا جاتا ہے: "**اگر ساری کائنات فنا ہو جائے تو علی اسے فنا کر دیں گے۔**"

یہ بات مسلم ہے کہ امام، جو بھی مقام رکھتے ہوں، نبی سے بہرحال کمتر ہیں؛ تو پھر یہ کیا ماجرا ہے کہ ائمہ اور سادات کی فضیلت میں اتنے زیادہ مجالس منعقد ہوتی ہیں اور اتنی کتابیں لکھی جاتی ہیں، مگر خود نبی کے بارے میں ایسا عمومی رواج نہیں؟ کیا اس کی کوئی اور وجہ ہو سکتی ہے سوائے باہمی رقابت اور ضد کے؟

ہم نے خود ایک مریض دیکھا جو وقفے وقفے سے بخار میں مبتلا ہوتا تھا۔ جب بخار آتا تو اس کی تیماردار کہتی: "کیا کریں، خدا کی مرضی ہے"، اور جب وہ اچھا ہو جاتا تو کہتی: "ائمۂ اطہار کی برکت سے شفا ملی۔" بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہی طرزِ فکر عام ہے: برے واقعات کو خدا کی طرف

منسوب کیا جاتا ہے، اچھے واقعات کو ائمہ کی طرف، اور نبی کو دونوں پہلوؤں سے تقریباً نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کہیں گے یہ باتیں عوام کی ہیں، علما سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں، یہی تو ہمارا طریقہ ہے کہ جب تک سامنے کوئی روکنے والا نہ ہو اور میدان کھلا ہو، ہم جہاں تک بن پڑے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں؛ لیکن جونہی کوئی شخص پیدا ہوتا ہے اور پوچھتا ہے کہ تم حد سے کیوں بڑھ رہے ہو، فوراً دس مورچے پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب زیادتیاں عوام کی ہیں۔ اسی لیے ہم یہاں **کتابِ کافی** سے چند صحیح احادیث پیش کرتے ہیں اور انہیں قرآن کی ان تصریحات کے ساتھ پرکھتے ہیں جو پیغمبر کے بارے میں آئی ہیں، تاکہ معلوم ہو کہ عوام کا یہ عقیدہ آخر کہاں سے جنم لیتا ہے۔

ابو حمزہ کہتے ہیں:
میں ان کے پاس داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ زمین سے کچھ چیزیں جمع کر رہے ہیں۔ میں نے پوچھا: یہ کیا ہیں؟ فرمایا: یہ فرشتوں کے پر کے ٹکڑے ہیں؛ ہم انہیں جمع کرتے ہیں اور ان سے اپنے بچوں کے لیے تکیہ بناتے ہیں۔

ایک اور مقام پر آیا ہے کہ پیغمبر کی وفات کے بعد جبرئیل حضرت فاطمہ کے پاس انہیں تسلی دینے آتے تھے اور آئندہ پیش آنے والے واقعات کی خبر دیتے تھے، اور امیرالمؤمنین انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک اور روایت میں اس مصحف کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ تمہارے قرآن سے تین گنا بڑا ہے، اور خدا کی قسم، اس میں تمہارے قرآن کا ایک لفظ بھی نہیں ہے۔

حالانکہ قرآن کہتا ہے کہ **روحُ الامین وحی کو تمہارے دل پر نازل کرتا ہے**، اور اس میں کہیں یہ ذکر نہیں کہ جبرئیل پیغمبر کے بعد بھی وحی لاتے رہے ہوں، یا یہ کہ ان کے پر و پشم زمین پر گرتے ہوں۔ مزید یہ کہ اگر ان روایات کو واقعی صحیح مان لیا جائے، تو پھر اسلام ایک پیغمبر کے بجائے چودہ پیغمبروں والا دین بن جاتا ہے۔

اور **کتابِ کافی** ہی میں یہ بھی آیا ہے کہ زرارہ کہتے ہیں:

میں نے امام سے ایک مسئلہ پوچھا، انہوں نے ایک جواب دیا۔ پھر ایک دوسرا شخص آیا اور اسی مسئلے کو پوچھا، تو انہوں نے اس کا دوسرا جواب دیا۔ پھر ایک تیسرا آیا اور اسی بات کو پوچھا، تو اس کو تیسرا جواب دیا۔
میں نے عرض کیا: آپ کے تین شیعوں نے آپ سے ایک ہی مسئلہ پوچھا اور آپ نے تین مختلف جواب دیے؟
انہوں نے فرمایا: اس لیے کہ ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے اور وہ پہچانے نہ جا سکیں۔

اور چند دوسری احادیث میں بھی اسی مفہوم کے جواب ملتے ہیں کہ یہ ایک اختیار ہے جو ہمیں دیا گیا ہے:
﴿ هَٰذَا عَطَآؤُنَا فَٱمْنُنْ أَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴾
یعنی: یہ ہمارا عطا کردہ اختیار ہے، چاہیں تو دیں اور چاہیں تو روک لیں، کسی حساب کے بغیر۔

اگر یہ احادیث بھی واقعی صحیح ہوں، تو پھر میرے پاس کہنے کو اور کیا باقی رہ جاتا ہے؟

تفسیر کی کتابوں میں قرآن کی بہت سی آیات کو امامت پر محمول کیا گیا ہے، یہاں تک کہ بعض مفسرین نے قرآن کے الفاظ "**صلاۃ**"، "**زکات**"، "**اِبل**" (اونٹ) اور "**بعوضۃ**" (مچھر) تک کی تفسیر علیؑ سے کی ہے۔

اگر امامت واقعی قرآن میں اس قدر بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتی تھی، تو پھر قرآن نے ایک مرتبہ بھی اسے صاف اور کھلے لفظوں میں کیوں بیان نہ کیا، تاکہ اس مسئلے پر یہ ساری لڑائیاں اور نزاع پیدا ہی نہ ہوتیں؟ وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا ﷺ کو یہ ڈر تھا کہ اگر وہ اس مسئلے کو کھل کر بیان کر دیں گے تو لوگ قبول نہیں کریں گے؛ حالانکہ خود قرآن اور سیرتِ نبوی اس بات کی گواہ ہے کہ نبی ﷺ کے طرزِ عمل میں کسی قسم کی مصلحت اندیشی یا تقیہ نہیں تھا۔ پھر یہ بھی عجیب بات ہے کہ آپ خود ہی نبی ﷺ سے منقول سینکڑوں احادیث پیش کرتے ہیں جن میں، آپ کے بقول، یہ مسئلہ صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے؛ تو پھر یہ کہنا کہ نبی ﷺ نے خوف کی وجہ سے بات نہیں کہی، آخر کیا معنی رکھتا ہے؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ: *"امامت کا ذکر قرآن میں بہت واضح تھا، مگر اسے نکال دیا گیا یا اس میں تحریف کر دی گئی، اور جب امامِ زمانہ آئیں گے تو وہ اصل اور صحیح قرآن لے کر آئیں گے۔"*

دیکھیے، ایک شاخ کو بچانے کے لیے کس طرح جڑ ہی کاٹ دی جاتی ہے۔

اگر واقعی ایسا ہو تو پھر قرآن اور تورات میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

رسولِ خدا ﷺ کی صداقت کی ایک بڑی دلیل خود قرآن ہے، اور دوسری دلیل یہ ہے کہ ان کی تعلیمات نے ان کے ساتھیوں پر کیا اثر ڈالا؛ اب ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ قرآن بدل دیا گیا، اور دوسری طرف یہ بھی کہا جاتا ہے: "رسولِ خدا کے بعد سب لوگ مرتد ہو گئے، سوائے تین کے۔"

اگر ہم حقیقت کی تلاش کے جذبے کے ساتھ قرآن اور ابتدائی اسلامی تاریخ کا مطالعہ کریں، تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آغاز میں امامت ایک نہایت سادہ یا زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی مسئلہ تھا، جس پر نہ قرآن نے کوئی صراحت کی اور نہ ہی مسلمانوں نے اسے عقیدے کی بنیاد بنایا۔ لیکن بعد کے زمانوں میں، جب ایرانی حکمرانوں نے یہ دیکھا کہ وہ عرب یا ترک خلفاء کی بالادستی قبول نہیں کر سکتے اور ان کے مقابلے کے لیے عوامی قوت کی ضرورت ہے، تو انہوں نے امامت کو مختلف رنگوں میں پیش کرنا شروع کر دیا۔ اور ہم، جو ہمیشہ افراط و تفریط کے عادی رہے ہیں، جس طرف چل پڑتے ہیں وہاں تک جاتے ہیں جہاں تک ممکن ہو: اگر علیؑ کی تعریف کرنا ہو تو انہیں اس مقام تک پہنچا دیتے ہیں کہ

"ان کے فضائل پر سمندر کا پانی بھی ناکافی ہے کہ انگلی بھگو کر صفحات گنے جا سکیں"؛

اور اگر عمرؓ کے بارے میں کچھ کہنا ہو تو وہاں تک چلے جاتے ہیں جہاں کی کیفیت آپ خود ہم سے بہتر جانتے ہیں۔

اگر پانی کی ایک نالی ایک ہی چشمے سے نکلے تو جوں جوں وہ نیچے اترتی ہے، اگر کم نہ ہو تو کم از کم بڑھتی بھی نہیں۔ اب آپ امامت کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں کو تاریخی ترتیب سے آپس میں موازنہ کر کے دیکھیے، یا ایک کتاب صفوی دور سے پہلے کی اور ایک اس کے بعد (مثلاً پہلوی دور کی) سامنے رکھ لیجیے؛ تب آپ خود دیکھ لیں گے کہ جتنا زمانہ آگے بڑھتا گیا ہے، اتنا ہی ان میں غلو بڑھتا چلا گیا ہے اور ان کی ضخامت بھی زیادہ ہوتی گئی ہے۔

آپ سید ابنِ طاؤس کی لکھی ہوئی **مقتل** کو *بحارالانوار* کی دسویں جلد سے، اور پھر اس کا موازنہ دربندی کی **اسرار الشہادہ** سے کر لیجیے؛ اس کے بعد خود سے سوال کیجیے کہ اس قدر شدید اختلاف کی وجہ کیا ہے؟ وہ باتیں جو دربندی نے لکھی ہیں، آخر وہ اسے کہاں سے ملیں، جن تک نہ سید ابنِ طاؤس کی رسائی تھی اور نہ مجلسی کی؟

ایک زمانہ ایسا تھا کہ سیاسی مصلحت یہ تقاضا کرتی تھی کہ ایران کی آزادی کے لیے، یا عثمانیوں اور ازبکوں جیسے دو طاقتور دشمنوں کے مقابلے میں اسے قائم رکھنے کے لیے، لوگوں کو گریہ و زاری، زیارت، جلوس، گنبد اور قبروں کے ذریعے متحرک کیا جائے؛ لیکن افسوس کہ وہ سیاست دان اپنی سیاست سمیت ختم ہو گئے، دنیا بھی صدیوں آگے بڑھ گئی، مگر یہ بدعتیں ہمارے لیے باقی رہ گئیں، اور معلوم نہیں ہم کب تک ان میں گرفتار رہیں گے۔

قرآن جو یہ کہتا ہے کہ سب سے زیادہ ظالم وہ لوگ ہیں جو خدا پر جھوٹ باندھیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ جو چیز دین کا رنگ اختیار کر لیتی ہے، وہ دیرپا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شہر کو سیاست کے نام پر ویران کر دیا جائے تو وہ اس سے بہتر ہے کہ دین کے نام پر کوئی بدعت گھڑ لی جائے۔ ماضی میں جو تباہیاں، لوٹ مار، جنگیں اور قحط پڑے، آج ان کا نشان صرف تاریخ کی کتابوں میں رہ گیا ہے؛ لیکن وہ بدعتیں جو سیاسی مقاصد کے لیے دین کے نام پر ایجاد کی گئیں، آج بھی قائم ہیں۔ اسی نسبت سے، جو لوگ بدعت کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں، ان کا کام زیادہ مفید اور خدا کے نزدیک ان کا اجر بھی زیادہ ہوگا۔

میں خوب جانتا ہوں کہ ان باتوں کا پڑھنا اُن لوگوں کے لیے کس قدر دشوار ہے جو امامزادوں کو خدا کی سلطنت میں سب کچھ کرنے والا یا دربارِ الٰہی کا وزیر سمجھتے ہیں؛ لیکن کیا کیا جائے؟ کیا ان خرابیوں کو دیکھتے رہنا اور خاموش بیٹھ جانا ممکن ہے؟ یہ درست ہے کہ ہماری مشکلات ان سے بھی کہیں زیادہ بڑی ہیں، لیکن فرق یہ ہے کہ لوگ چونکہ انہیں مسئلہ سمجھتے ہیں، اس لیے مجبوری کے تحت ان کی اصلاح کے بارے میں سوچتے بھی ہیں؛ مگر ان امور کو، اس کے برعکس، نہ صرف یہ کہ مسئلہ ہی نہیں سمجھا جاتا بلکہ انہیں دنیا و آخرت کی سب سے بڑی سعادت کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔ یہی اصل گرفتاری ہے، جو چاہے بظاہر کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، حقیقت میں نہایت بڑی ہے۔

ایرانیوں نے — جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں — خدا اور پیغمبر کو امامت پر قربان کر دیا ہے، اور — جیسا کہ آگے بھی واضح ہوگا — اپنی زندگی، اپنا ملک، اپنا مال اور اپنا وقت بھی اسی راہ میں لگا دیا ہے؛ حالانکہ امام جو بھی ہو، وہ صرف اپنے زمانے کے لیے امام ہوتا ہے، بعد کے زمانوں کے لیے نہیں۔
جیسا کہ کتاب کافی میں آیا ہے:

«ہر امام اپنے ہی زمانے کے لوگوں کا رہنما ہوتا ہے»۔

اور اگر *نہج البلاغہ* کو بھی دلیل بنایا جائے تو خود امام علی ابن ابی طالب اپنے اُس خط میں جو انہوں نے معاویہ کو لکھا ہے، یہ بات بیان کرتے ہیں کہ اگر مہاجرین و انصار کی شوریٰ کسی شخص کو امام مقرر کر دے، تو وہی خدا کی رضا شمار ہوتی ہے (ملاحظہ ہو: خطوط کے حصے میں چھٹا خط)۔

تاہم ہم اس بحث میں پڑنے کے خواہش مند نہیں ہیں، کیونکہ نہ اس سے ہماری موجودہ حالت کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے، اور نہ ہی اس قدر اغراض و تعصبات کے ہوتے ہوئے دونوں فریقوں کے طرزِ عمل کی حقیقت تک درست طور پر پہنچا جا سکتا ہے۔ لیکن جو بات یقینی ہے، وہ یہ کہ امام کا مرتبہ پیغمبر سے کہیں نیچے ہے؛ اور خود پیغمبر بھی قرآن کے مطابق ایک بشر ہیں، دوسرے انسانوں کی مانند، جو نہ غیب جانتے ہیں، نہ بابُ الحوائج ہیں، نہ اندھوں کو شفا دیتے ہیں۔ ان کی دوسروں سے واحد امتیازی خصوصیت وحی ہے۔

یہ تمام بحثیں اور عقائد دراصل سیاست کی پیداوار، تقلید سے پروان چڑھنے والے، اور عادت کے بل پر قائم رہنے والے تصورات ہیں۔

آج کے دین نے عزاداری کو سب سے عظیم اعمال میں شمار کیا ہے، یہاں تک کہ ایک حدیث میں اس کا ثواب ہزار حجوں، ہزار عمرے، اور ہزار جہاد کے برابر بیان کیا گیا ہے، ساتھ ہی پیغمبر خدا اور تمام انبیاء، رسول، صدیقین اور شہداء جو دنیا کے آغاز سے قیامت تک فوت یا شہید ہوئے، ان کے ثواب کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ایک بار اس حدیث کو غور سے پڑھیں اور دیکھیں کہ خدا پر جھوٹ اور مبالغہ اس سے بڑھ کر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ سچ پوچھیں تو اگر جنت اور دوزخ کا اختیار ایک نادان بچے کے ہاتھ میں ہوتا، تو وہ بھی ایسا ہی عمل کرتا؟ شاید ان لوگوں کے لیے جو ایسے مبالغات سن سن کر کانوں سے پر ہو گئے ہیں، یہ بات نئی نہ ہو اور وہ کہیں: "خدا کی قدرت سے کیا بعید؟" لیکن وہ یہ نہیں سوچتے کہ خدا صرف قادر ہی نہیں بلکہ عادل بھی ہے۔ آپ اپنی مرضی سے ایک لیر کو ریال کے بجائے خرچ کر سکتے ہیں؛ لیکن کیا ایسا کریں گے؟ فرض کریں، قیامت کے دن آپ عزاداری کرنے والے جا پہنچیں اور جنت کی اعلیٰ منزلیں آپ کے لیے مخصوص کر دی جائیں (یہ آرزو نوجوانوں کے لیے عیب نہیں)، اور اس حدیث کے مطابق بدر و احد کے شہداء اور تمام پیغمبران آپ کے ماتحت رکھ دیے جائیں۔ کیا واقعی آپ وہاں بلا جھجک بیٹھیں گے؟ کیا آپ کو شرم نہیں آئے گی اگر شہداء بدر خدا سے شکایت کریں: "ہم

نے اسلام کی کمزوری کے وقت اس کی حمایت میں اٹھ کر اپنی جانیں قربان کیں اور اس کی بنیاد اپنے خون سے مضبوط کی، تو پھر آپ نے ہمیں ہزار درجے نیچے رکھ کر عزادار کو اوپر کیوں بٹھایا؟"کیا اس صورت میں آپ کے لیے وہاں بیٹھنا آسان ہوگا؟

آپ کہیں گے: "یادگار رکھنا اور گذشتہ بزرگان کا احترام کرنا ایک اچھا عمل ہے؛ فرض کریں یہ احادیث جھوٹی بھی ہوں، اصل کام برا نہیں ہے۔" میں کہتا ہوں: کچھ سوداگر اپنے ہر مال کے لیے ایک اچھا نمونہ سامنے رکھ دیتے ہیں تاکہ گفتگو کے وقت وہ دکھایا جا سکے، لیکن جب مال فراہم کرتے ہیں، اصل چیز کچھ اور ہوتی ہے۔ آج کا دین بھی کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے؛ جیسا کہ اس موضوع میں ہم دیکھتے ہیں، گفتگو کے دوران—خاص طور پر متجسس لوگوں کے ساتھ—کہتے ہیں: "یہ زیارت اور عزاداری یادگار رکھنے اور احترام کے لیے ہے، اور دوسرے بھی ایسا کرتے ہیں"، لیکن عمل میں حقیقت کچھ اور ہے۔ ایک طرف، ہر شہر اور دیہات میں اتنے عزاخانے بچوں کے کھیل کے اوزاروں کی طرح تعمیر کیے گئے ہیں، اور ہر سال کئی بار اس میں بچوں جیسے حرکات کی جاتی ہیں؛ دوسری طرف، سال کے کئی مہینے عزاداری کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں، اور پھر بھی یہی کم نہیں ہے، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیشہ یا سین لوگوں کے کانوں میں پڑتا رہے، اسی لیے کہتے ہیں: "کلُ یَومٍ عاشوراء"۔

اب اگر اس سب وقت اور خرچ کا کوئی عقلمندانہ نتیجہ نکلتا تو اچھا ہوتا؛ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کو بیدار کرنے کے بجائے، یہ گھماؤ دار جھوٹ ان کے دماغ میں بٹھا دیے جاتے ہیں، اور نتیجتاً اس تودے کی عقل کی قوت سست پڑ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے رسوا جھوٹ کو دین کے نام پر قبول کیا جاتا ہے، جبکہ علم اور زندگی کی حقیقتوں پر طنز کیا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ کہ فرض کریں جو کچھ امامت کے بارے میں کہا جاتا ہے، درست بھی ہو، تب بھی یہ حد سے بڑھنے والے رویے غلط ہیں، کیونکہ ہر راہ میں، اور خاص طور پر راہِ خدا میں، شخص کا نام نظر نہ آئے۔ امامت، اپنی جگہ، خود نبوت کو بھی دین کا حصہ نہیں سمجھا جانا چاہیے، کیونکہ یہ دین کے رہنما ہیں، خود دین کا جزو نہیں؛ جیسے اگر کوئی آپ کو کوئی راستہ دکھائے، تو وہ آپ کے مقصد کا رہنما ہے، مقصد کا حصہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اپنے کام کی طرف بڑھ جاتے ہیں۔ اگر آپ راستہ چھوڑ کر رہنما پر نظر جمائیں، تو لازماً مقصد سے دور رہ جائیں گے، جیسا کہ آج ہم دور ہیں۔

اور یہ کہ "پہلے شخص کو جاننا ضروری ہے تاکہ اس کے کہے پر ایمان لائیں" درست نہیں؛ کیونکہ کسی بھی شخص کے رہنما، معمار، طبیب، نجار یا لوہار کے کام سے ہی اس کی پہچان ہوتی ہے، نہ کہ شخص سے۔

اگر یہ بیہودہ گفتگو جو ناموں اور اشخاص پر مرکوز ہے، اصل مقصد یعنی توحید اور تقویٰ پر ہوتی، تو نہ صرف یہ اختلافات جلد ختم ہو جاتے بلکہ بہتری کے ساتھ ترقی بھی ہوتی۔ ﴿ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ ﴾ ۔

تیسرا موضوع: علمائے دین

ہمارا موجودہ دین کہتا ہے کہ فقہاء، زمان غیبت میں، امام کے جانشین ہیں۔ اس بات پر کئی فقہی اور عملی اعتراضات وارد ہیں، جنہیں اختصار کے لیے یہاں ذکر نہیں کرتے اور بس اتنا کہہ دیتے ہیں کہ: اگر یہ نیابت صرف احکام شرعی کی بیان کے لیے ہے، تو یہ بالکل آپ کے مقصد کے خلاف ہے؛ اور اگر اس کا تعلق ولایت اور حکومت سے بھی ہے، تو پھر ہر محلے میں، اور بعض اوقات ایک ہی گھر میں، کئی بادشاہ ہوں گے؛ جیسا کہ آج بھی ہر فقیہ، جہاں تک رسائی رکھتا ہے، اس کام میں دخل اندازی کرتا ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہ ہر کسی کو ہر کام کے لیے بنایا گیا۔ فقہ اور کشورداری، بالکل ویسے جیسے طبیب اور مکینک کے کام، آپس میں کوئی ربط نہیں رکھتے، اور ان سب کے بعد، وہ بھی کہ فقیہ کو حکومت کا حق حاصل ہے، فقہی بنیادوں پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں: «ضروری نہیں کہ حکومت فقیہ کے ہاتھ میں ہو؛ بلکہ جو بھی حکومت کرے، اسے فقہاء کی اجازت حاصل ہو؛ جیسا کہ بعض شاہان نے پہلے بھی یہی کیا، اور ایران کے آئین میں بھی یہی ذکر ہے۔»

میں کہتا ہوں: یہ اجازت اگر صرف رسمی یا تبرکی اعتبار سے ہے، تو اس کا کوئی عملی نتیجہ نہیں نکلتا۔ پھر بھی، معاملے کو خالی نہ چھوڑنے کے لیے، میں اسمبلی اور حکومت کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ جو بھی ملک اور عوام کے مفاد میں سمجھیں، کریں؛ اور اگر یہ خیال ہے کہ ملک کے سب کام فقہاء کی ہدایت سے ہوں، تو یہ ناممکن ہے، اور دوسرے لفظوں میں، ایک چکر میں پھنس جائیں گے؛ کیونکہ اس حساب سے قانون، اسمبلی اور حکومت کی موجودگی فقہاء کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں، اور فقہاء کی موجودگی کے باوجود قانون، اسمبلی اور حکومت کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہے گا(مزید تفصیل کے لیے "موضوع حکومت و قانون" دیکھیں)۔

آج کا ہمارا دین کہتا ہے: چاہیے کہ تقلید صرف از مجتہد زندہ کیا جائے، اور نتیجتاً، جیسے ہی کوئی مجتہد فوت ہو جائے، لوگوں نے جو کتابیں اور رسائل سیکھی ہیں، وہ سب ردی کی جائیں اور دوبارہ لوگوں کو نئی کتابیں خریدنی پڑیں اور کئی وقت صرف سیکھنے میں گزارنا پڑے؛ کیوں؟ اس کام کا دلیل کیا ہے؟ عرض کرنے میں شرم آتی ہے؛ بلکہ دلیلِ نقل اور عقل اس کے برعکس ہے، کیونکہ نقل کہتی ہے: 'پس ہماری حدیثوں کے راویوں کی طرف رجوع کرو'۔ اگر حیات شرط ہوتی، تو پھر یہ روایتیں بھی کنارے رکھنی پڑتیں؛ اور عقل بھی کہتی ہے کہ اگر کوئی عالم، چاہے وہ طبیب ہو، انجینئر ہو یا فقیہ، اپنی فن میں کوئی کام کرے اور مر جائے، تو اس کا قول اپنی اہمیت کے اعتبار سے باقی رہتا ہے؛ ورنہ ہر عالم کے مرنے کے بعد اس کے آثار، جیسے رسائلِ عملیہ، بھی

پھینک دیے جائیں اور دوبارہ سب کچھ شروع کرنا پڑے۔

شاید کچھ لوگ جو پیچھے ہیں کہیں: 'یہ کام زمانے کے تقاضے کی رعایت کے لیے ہے اور خود اچھا کام ہے'، لیکن اہلِ علم جانتے ہیں کہ بات اس کے برعکس ہے، اور اس کا دلیل وہ رسائل ہیں جو مسلسل بدلتی رہتی ہیں؛ دیکھیں کہ بعد کی رسائل میں کونسی رعایتِ زمانہ ہوئی ہے جو پہلے کی رسائل میں نہیں تھی۔"

شاید آپ کہیں کہ یہ بات اتنی طویل کیوں کی جائے؛ کیسے ممکن ہے کہ کوئی ایسا حکم بغیر کسی دلیل کے خود سے صادر کرے؟ آری، دنیا میں ہر کوئی جو بھی دعویٰ کرے، کہتا ہے: "میرے پاس دلیل ہے"، لیکن خدا نے ہم کو ایک ترازو دیا ہے جسے عقل کہتے ہیں، اور اگر یہ خواہشات، عادت اور تقلید سے آزاد ہو، تو آسانی سے درست کو غلط سے پہچان سکتا ہے۔اس حکم کے لیے بھی ایک خیالی اور طولانی دلیل بنائی گئی ہے جسے "اصل عدم جواز" کہتے ہیں، اور بہتر ہے کہ اس کا مطلب خود اہلِ فن سے پوچھیں تاکہ دیکھیں کہ آپ کے دینی احکام کس بنیاد پر قائم ہیں۔میں جانتا ہوں کہ جو لوگ عمر بھر اس طرح کی باتوں کے ساتھ بزرگ ہوئے ہیں، وہ یقین نہیں کریں گے کہ ان احکام کے مدارک جنہیں ہم صدیوں تک خدا کے مسلم حکم جانتے رہے، اتنے کمزور اور غیر مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اور شاید وہ یہ سمجھیں کہ ہمارے پاس کچھ اور مدارک بھی ہیں جو ہم نے نہ دکھائے ہوں؛ لیکن انہیں یہ جاننا چاہیے کہ میں یہ باتیں "کوہ قاف کے پار" نہیں لکھ رہا۔

ہمارے پاس یہاں ایک ہتھیار ہے اور وہ ہے حقیقت۔ پس کیسے ممکن ہے کہ ہم خود اس کو توڑیں؟ میں قسم نہیں کھاتا، لیکن آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس کتاب میں کہیں بھی ایک لفظ بھی حقیقت کے خلاف نہیں لکھا، حتیٰ کہ عام مبالغہ آمیز جملوں سے بھی پرہیز کیا گیا؛ بلکہ اس کے برعکس، چونکہ میں چاہتا تھا کہ دلائل ہر جگہ واضح اور مضبوط ہوں اور ادب کی حد سے تجاوز نہ ہو، اس لیے بہت سی باتیں بھی بیان نہیں کی گئیں۔

ایک اور عنوان جو علماء کے لیے درست کیا گیا وہ یہ ہے کہ: "جو شخص عالم کے جوتے کو جوتا کہے، کافر ہو جاتا ہے"؛ نتیجتاً، روحانی کے لیے ایک ایسا بلند مقام قائم کر دیا گیا کہ کوئی بھی شخص اصلاح کے ارادے سے اس نظام تک ہاتھ نہیں بڑھا سکا۔ اگرچہ یہ بات بظاہر روحانی کے حق میں ہے، لیکن در حقیقت، یہ دین اور دنیا دونوں کے لیے ایک بڑا نقصان ثابت ہوا، بلکہ خود روحانی کے لیے بھی۔ کیونکہ یہ واضح ہے کہ جب ہر چیز پر اعتراض اور چون و چرا بند کر دیا جائے، تو اس پر فساد کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

یقینا صرف خدا کے کام میں چون و چرا کا کوئی مطلب نہیں، کیونکہ وہ ایک مکمل نظام کے تحت ہے اور ہمارے فکر و اختیار کے دائرے سے باہر ہے؛ لیکن دیگر جگھوں پر ہم خود دیکھتے ہیں کہ نتیجہ اس کے برعکس ہوتا ہے۔ حکومت کے کام میں لوگوں کی زبان بند کر دی گئی تو فساد کا راستہ کھل گیا؛ امام حسین کے معاملے میں کہا گیا کہ جو اعتراض کرے، وہ پیچھے ہٹے، اور اس کے نتیجے میں وہ تمام بیہودہ کام جو نام اس کے لیے کیے گئے

درست سمجھے گئے؛ دین کے معاملے میں اعتراض کے راستے بند کیے گئے تو دروغ اور بھاری بوجھ دین کے نام پر لوگوں پر ڈال دیے گئے؛ اور ملا کے بارے میں کہا گیا: "جو شخص اس کے جوتے کو جوتا کہے، کافر ہو جائے"۔ نتیجہ یہی ہوا۔

جب پانی سرچشمے سے نکلتا ہے، تو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک دانشمندانہ راستہ کھولا جائے اور اس سے نتیجہ اخذ کیا جائے؛ لیکن اگر کوئی زور لگا کر اسے روکنے کی کوشش کرے کہ باہر نہ آئے، تو چاہے نہ چاہے یہ کسی نہ کسی طرف سرک کر نکل جائے گا، اور نتیجتاً، نہ صرف ضائع ہوگا بلکہ نقصان بھی زیادہ ہوگا۔جو شخص زور لگا کر دلیل اور منطق کو روکنے کی کوشش کرے، وہ کچھ وقت کے لیے شاید کامیاب ہو جائے، لیکن اس کے نتیجے میں خرابی اور زیادہ شدت اختیار کر لے گی۔رضا شاہ نے لوگوں کے قلم اور زبان پر پابندی لگائی؛ لیکن جیسے ہی آزادی کا نام آیا، لوگ ایک درجے بھی جمہوریت سے آگے بڑھ گئے اور "تھری ڈیموکریسی" بن گئے، اور اس کی نیکیوں کو بھی بھلا دیا۔

ملا نے بھی جب خود اور عوام کے درمیان وہ لوہے کی دیوار کھڑی کی، تو یہی جذبات کلکتہ، مصر، قفقاز اور دیگر جگہوں سے اور بھی بدتر شکل میں نمودار ہوئے، یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب ایک ملا گلی سے گزرتا، تو لوگوں کی طنز و مزاح اس پر برسنے لگتی اور دل میں یقین کئی گنا بڑھ جاتا، حتی کہ صرف ایک جھلک زبان پر آتی۔

ہم سب کو وہ دن یاد ہیں جب کہا جاتا تھا کہ ملا کو گاڑی میں نہیں بٹھائیں گے، اور اگر راستے میں پنچر ہو جائے تو قدموں کے ذریعے اس کا اندازہ لگایا جائے؛ لیکن حالیہ برسوں میں رضا شاہ کی اصلاحات کی بدولت وہ بدگمانی ختم ہو گئی، اور موجودہ احترام اسی اصلاح کی نتیجہ ہے۔

اور اب بھی اگر وقت کو غنیمت نہ جانا جائے اور اصلاح کے بجائے لوگوں کی زبان بند کرنے پر توجہ دی جائے، تو یقیناً یہ صورت حال پہلے سے بھی بدتر ہوگی۔ اگر یقین نہیں آتا، تو اس بات کو یاد رکھیں تاکہ آپ اس کی درستگی اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ ایک اور عنوان جو عالم کے لیے بنایا گیا اور اس نظام کو فاسد کر گیا، یہ ہے کہ:

"آج عالم اپنی روزی براہِ راست عوام سے حاصل کرتا ہے؛ نتیجتاً، وہ مجبور ہے کہ ہمیشہ عوام کی خواہش کے مطابق بات کرے، یا کم از کم ان کی مخالفت میں کچھ نہ کہے۔"

اس کے دو بڑے نقصانات ہیں:

اول: عوام میں غلط خیالات بہت پیدا ہوتے ہیں، لیکن چونکہ یہ "عوام" کے نام سے ہیں، عموماً دیرپا نہیں ہوتے؛ لیکن ملا کے قبول کرنے یا خاموش رہنے کے بعد یہ غلط خیالات مستند ہو جاتے ہیں، اور ہر کسی پر لازم ہو جاتا ہے کہ اسے قبول کرے اور اپنی اولاد کے لیے وراثت میں چھوڑ دے۔ یوں اسی سبب سے بہت سی خرافات جنم لیتی ہیں۔

دوم: اس کے بجائے کہ عوام ملا کی تقلید کریں، ملا خود عوام کی مقلد بن جاتا ہے؛ اور اگر عوام راستہ جانتے ہوتے تو پھر روحانی کی ضرورت ہی کیا تھی؟روحانی یعنی روح کا طبیب، اور طبیب کا کام بھی بدن میں ہے: مریض کو دوا دینا، تلخ یا تیز علاج کرنا۔ اگر وہ صرف مریض کی خواہش کے مطابق دوا یا غذا دے، تو وہ طبیب نہیں بلکہ ایک خادم یا کیفی (کافہ‌چی) بن جائے گا۔

روحانی کا کام بھی ایسا ہی ہے: وہ مغزوں سے تصوراتِ غلط کو دور کرتا ہے، خرافات کو باہر نکالتا ہے، اور دین کو جھوٹ سے پاک کرتا ہے — اور یہ سب کام عموماً عوام کی خواہش کے خلاف ہوتا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ کون ایسا ہے جو خود کو اس سختی کے لیے تیار کرے، اور ساتھ ہی عورت و بچوں کی بھوک کا بھی جواب دے؟

روحانی بھی خدا کا بندہ ہے اور قانونِ فطرت سے باہر نہیں ہے؛ جب اس نے دیکھا کہ اونٹ اُس کے پاس گھٹنے ٹیکتا ہے جو محتاط تر ہے، جب اس نے دیکھا کہ لیرے، مال اور عزت اُس کے پاس جاتے ہیں جو زیادہ خرافاتی ہے، جب اس نے دیکھا کہ منبر اور روضہ میں وہ آگے ہے جو جھوٹ بہتر بُنتا ہے، اور ملا دوسرا جو اُن کے برابر ہے مگر عوام کی خواہش کے مطابق بات نہیں کرتا، نان کے لیے بھی پریشان ہے، تو یہی لمحہ اس کے لیے ایک ساری عمر کا درسِ عمل بن جاتا ہے۔

ایک واضح مثال: آج سب جانتے ہیں کہ قمہ زنی شرع کے خلاف ہے؛ سب جانتے ہیں کہ آج کے یہ روضے زیادہ تر جھوٹ ہیں، اور خدا اور پیغمبر کے بارے میں جھوٹ سب سے بڑا جھوٹ ہے؛ پھر بھی ایک ملا کیوں جرأت نہیں کرتا کہ لوگوں کو اس کام سے روکے؟ اس لیے کہ وہ جانتا ہے، اگر یہ بات اس کے منہ سے نکل گئی، تو اس کی روٹی کا کام مشکل ہو جائے گا۔ روحانی اگر وہ سب کچھ کہہ سکتا جو وہ جانتا ہے، تو دین اور ہماری زندگی کی حالت آج کے مقابلے میں بہت بہتر ہوتی۔ ملا اگر اپنی روٹی کے کھٹکے سے نہ ڈرتا، تو یہ راز پردے کے پیچھے نہ رہتے، اور جیسا کہ مشہور کہاوت ہے، کوئی اونٹ کو چھت سے نیچے لا سکتا ہے جو اس نے خود اوپر چڑھایا ہو۔ یہ کام زیادہ تر خود ملا کے ہاتھ میں ہے، نہ کہ رضا شاہ، نادر یا ان جیسے لوگوں کے پاس۔ ہاں، مادی طاقت بھی اس کام میں ضروری ہے، مگر شرط یہ ہے کہ روحانی یا معنوی طاقت پہلے آگے بڑھ چکی ہو، اور لوگوں کے دل قبول کرنے کے لیے تیار کیے جا چکے ہوں۔

پچھلی دفعہ جب میں یہ موضوع لکھ رہا تھا، روز عاشورا تھا؛ اچانک باہر شور و غوغا کی آواز سنائی دی۔ باہر نکلا تو دیکھا کہ آج کے عزاداری کے جلوس کی داستان شہرِ اھواز کے جلوی شہربانی تک پہنچ گئی ہے۔ یہاں میں اس داستان کی تفصیل میں نہیں جانا چاہتا کہ یہ کس طرف گیا، مقصد صرف یہ

تھا کہ لوگوں کی حالت بیان کروں: جب یہ جلوس منتشر ہوا، تو لوگ ایسے افسوس کرتے تھے جیسے کسی مدافع فوج نے لشکر کے سامنے بھاگنے کی ہمت نہیں کی ہو۔ جو نقصان انہیں پہنچا، اسے آج کی معجزات اور ان کی شقاوت سمجھتے؛ اور جو اجر انہیں ملنا چاہیے تھا، وہ ام البنین سے طلب کرتے۔ اور جب رات کو ریڈیو کے سامنے بیٹھا، تو دیکھا کہ ریڈیو تہران نے خود حکومت کی دی گئی ہدایت کی حمایت کرنے کی بجائے وہی روضے اور گزافے نشر کرنا شروع کر دیے، جو ہم سب جانتے ہیں۔

دین کے احکام بیان کرنے کے لیے مزدوری لینا، اس کے علاوہ کہ یہ دین میں فساد پیدا کرتا ہے، فقہاء کے قول کے مطابق بھی حرام ہے؛ اور ایسے لوگ صرف بیت المال سے ہی حقوق لے سکتے ہیں، نہ کہ عوام سے۔ جیسا کہ آج بھی معلوم ہے، سرکاری ملازمین کو کام عوام کے لیے کرنا ہوتا ہے، مگر تنخواہ خزانے سے ملتی ہے؛ کیونکہ اگر یہ عوام سے لی جائے، تو کام تو زیادہ تیزی سے ہوگا، لیکن جیسا کہ دین اور روحانی کے حوالے سے دیکھا، کاموں کا چکر صرف ذاتی مقاصد کی طرف چلا جائے گا اور نقصان بہت زیادہ ہوگا۔

غلط فہمی نہ ہو؛ یہ مطلب درست نہیں ہے کہ حکومت روحانی امور میں مداخلت کرے، کیونکہ اس صورت میں پھر "پیراھن عثمان" دوبارہ غلط ہاتھوں میں جا سکتا ہے؛ اور اس کے علاوہ، روحانی حضرات بھی حکومت کے تحت نہیں آئیں گے۔ جیسا کہ حکومت نے "دانشکدہ معقول و منقول" قائم کرنے کی کوشش کی، شاید یہی مقصد تھا، لیکن دیکھا گیا کہ یہ دانشکدہ بھی ایک ایسی فیکٹری بن گئی جہاں صرف پیچھے بیٹھ کر کاغذی کام ہوتا رہا۔

اس کام کے لیے جو واحد طریقہ یاد آتا ہے اور جو نہ کسی قانون سے ٹکراتا ہے اور نہ کسی عقیدے سے، وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں آج کئی موقوفات موجود ہیں، جن کا مصرف روزہ وغیرہ ہے۔ اگر ان کی آمدنی ایک روحانی سربراہ اور ایک منظم لیکن غیرسرکاری ادارے کی نگرانی میں صحیح طریقے سے اس کام پر خرچ کی جائے، تو ایک طرف وقف کی اصل مقصد پوری ہوگی اور دوسری طرف دین و زندگی کے لیے سب سے بڑی خدمت بھی ہوگی۔

لیکن اگر عوام ایسے ہی رہیں اور روحانی حضرات بھی ویسے ہی، تو نہ مردوں پر بلکہ زندگان پر ہی رونا چاہیے۔

شاید آپ کہیں کہ آپ یا تو مجتہد ہیں یا مقلد؛ اگر آپ مجتہد ہیں تو آپ کے لیے اپنے قول حجت ہے اور دوسروں کے کام نہیں آتا؛ اور اگر مقلد ہیں تو "جاھل بر عالم بحثی نیست"، یعنی یہ فضولیاں آپ تک نہیں پہنچتیں۔ آری، یہ بات درست ہے، **لیکن صرف راستے کے لیے ہے، نتیجہ کے لیے نہیں۔**

یعنی اگر آپ نے اپنی جامہ کو درزی کے سپرد کیا تاکہ وہ سینے، کندھوں اور قد کے مطابق درز کرے، تو یہ نہیں کہنا چاہیے کہ وہ کس طرح کرے یا کس راستے سے کرے؛ لیکن جب جامہ واپس آپ کے پاس آئے، تو وہ آپ کی جسامت کے مطابق درست ہونا چاہیے، ورنہ یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ کہیں: "آپ نے میرا وقت، پیسہ اور جامہ ضائع کر دیا۔"

اسی طرح قانون گزار کے بارے میں بھی یہی بات ہے: یہ نہ پوچھیں کہ حکم کس طرح اور کس راستے سے آیا، لیکن جو حکم آپ کو ملا، وہ عقل اور طبیعت کے اصول کے مطابق درست ہونا چاہیے، کیونکہ یہ اصول خدا کے مقرر کردہ ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو، تو آج کی طرح ہوتا ہے کہ ایک سادہ آیت:

﴿ إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ ﴾

جو بہت سادہ ہدایت ہے اور حدودِ اس کو ہر انسان اپنی فطرت سے سمجھ سکتا ہے، اس پر کئی کتابیں لکھ دی جاتی ہیں۔

نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ: حمام کے خزینہ کا پانی یا مسجد کے حوضِ جمعہ کا پانی، جتنی بھی آلودگی کے باوجود، پاک ہے؛ لیکن پاکیزہ ترین پانی بھی اگر چھوٹی سی مقدار میں نجس چیز لگ جائے تو نجس ہو جاتا ہے۔ یا پانی جس کی مقدار ایک "کُر" ہو، اگر کُتا اس میں پیشاب کرے تو یہ صاف رہتا ہے کیونکہ مقدار زیادہ ہے، لیکن اگر اسی پانی سے کوئی پی لے تو نجس ہو جائے گا کیونکہ مقدار کم ہو گئی۔

افسوس کہ ہم اپنی زندگی آنکھ اور کان بند کر کے گزارتے ہیں اور ایسے ہیں جیسے کوئی حیوان ہو جسے پتھر سے باندھ دیا گیا ہو؛ اسی طرح اسی گمان میں کہ ہم نے علم کی راہ طے کی ہے، اسی طرح اسی اندیشے میں اٹھاسی سال چلتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اب ہم جنت کی دروازے تک پہنچ گئے ہیں؛ لیکن جب آنکھ کھلتی ہے، دیکھتے ہیں کہ ہم وہیں ہیں جہاں پہلے تھے۔ آری، یہی سزا ہے اس کا جو خرد کی آنکھ بند کر دیتا ہے اور جہاں لے جائیں، نادانستہ چلتا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ: دنیا کی ہر چیز، چاہے اس کی قیمت جتنی بھی زیادہ ہو، اگر حد سے گزر جائے، تو نقصان بھی اتنا ہی زیادہ ہو جائے گا۔

پیشہ ور ڈاکٹر، چونکہ لوگوں کی جان بچاتا ہے، دوسروں سے زیادہ قابل احترام ہے؛ لیکن اگر اپنے کام میں بے پرواہی کرے، تو سب سے بدترین لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔

روحانی بھی اگر سچائی کے ساتھ اپنے فریضے پر عمل کرے، تو ڈاکٹر سے بھی بلند ہے، کیونکہ ڈاکٹر جان بچاتا ہے، لیکن روحانی روح کو بچاتا ہے، اور جان کی قیمت بھی اسی سے ہے۔

اب اگر یہ شخص اپنے دائرے سے آگے بڑھ جائے یا اپنا فریضہ الٹا انجام دے، تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب سے پست انسان ہے۔ واضح طور پر کہوں تو: ایسے شخص کا نقصان ایک ملک کے لیے، نایب حسین کاشی کے نقصان سے بھی زیادہ ہے جو کسی شہر کے لیے ہے؛ کیونکہ وہ مال لے جاتا ہے، لیکن یہ خرد کو ضائع کرتا ہے؛ وہ لوگوں کے گھروں میں ناحق قدم رکھتا ہے، لیکن یہ دلوں میں گھس جاتا ہے؛ اس کے اثرات بعد میں ختم ہو جاتے ہیں، لیکن جو بدعتیں اس نے قائم کی ہیں، وہ صدیوں تک باقی رہتی ہیں۔

چوتھا موضوع: حکومت

آج کا ہمارا دین کہتا ہے: جو بھی حکومت قیام(قائم) سے پہلے قائم کی جائے، باطل ہے:

«كُلُّ رَايَةٍ تُرْفَعُ قَبْلَ قِيَامِ الْقَائِمِ فَصَاحِبُهَا طَاغُوتٌ يُعْبَدُ مِنْ دُونِ اللَّهِ»()۔

یہ کہتا ہے: «سلطان کے ساتھ کام کرنا اور اس کا ساتھ دینا عدیل (کفر) ہے»۔

«سَأَلْتُهُ عَنْ عَمَلِ السُّلْطَانِ؟ فَقَالَ: الدُّخُولُ فِي أَعْمَالِهِمْ وَالْعَوْنُ لَهُمْ وَالسَّعْيُ فِي حَوَائِجِهِمْ عَدِيلُ الْكُفْرِ»()۔

یہ کہتا ہے: «غیر امام کے ساتھ لڑائی میں شرکت کرنا، سور کا گوشت کھانے اور خون پینے کے مترادف ہے»۔ بلکہ صحیح حدیث میں تو دشمن کے خلاف جنگ کے لیے تیار رہنے کو بھی منع کیا گیا ہے۔

شگفتہ ہے کہ افریقہ کے وحشی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے لیے ایک منظم انتظام کار ہونا ضروری ہے جو ان کے منتشر افراد کو اکٹھا کرے، اور سب سے کم عقل حیوانات بھی دشمن کے مقابلے کے لیے خود کو تیار کرتے ہیں؛ لیکن ہم نے ہدایت یافتہ فرقہ کے درمیان، انسان اور حیوان دونوں میں، ایک نیا اور حیران کن اصول بنا دیا ہے جسے کوئی بھی دکان یا عطاری نہیں بیچتی۔

اور چونکہ یہ بات اتنی بے بنیاد ہے کہ وہ لوگ جو ہر چیز کو ایک عربی جملے کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں، اسے قبول نہیں کریں گے، ناچار اسے دوسرے رنگ و روپ میں پیش کیا گیا، جن پر ہم ایک ایک کر کے گفتگو کریں گے اور پھر اس عقیدے کے نقصانات بیان کریں گے۔

وہ کہتے ہیں: «**حکومت فقیہ کے ہاتھ میں ہونی چاہیے**»، حالانکہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس دعوے کی کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں؛ اور اس کے علاوہ، جب کسی چیز کو کسی اور چیز کے لیے شرط قرار دیا جائے تو ان دونوں کے درمیان کوئی معقول مناسبت بھی ہونی چاہیے۔

مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ **انجینئر کو ریاضی آتی ہو یا قاضی فقیہ ہو** تو یہ بات درست ہے؛ لیکن اگر کہا جائے کہ **انجینئر فقیہ ہونا چاہیے** تو آپ خود ہی اس شرط پر ہنسیں گے کہ فقہ اور ہندسہ میں آخر کیا تعلق ہے؟

ایک بادشاہ (حاکم) کے لیے سب سے پہلے اس کام کی **فطری صلاحیت** ضروری ہے، پھر اسے فوجی، تاریخی اور اسی نوع کی معلومات پر گہری دسترس ہونی چاہیے۔ جس شخص کا ایک ایک گھنٹہ ملک کے لیے لاکھوں کا فائدہ یا نقصان رکھتا ہو، اس کے لیے کیا فائدہ ہے کہ وہ اپنا قیمتی وقت اس بحث میں صرف کرے کہ **واجب کا مقدمہ واجب ہے یا نہیں؟**

مزید یہ کہ ہم کہتے ہیں: **ملک ایک کشتی کی مانند ہے**، اسے ایسے ناخدا کی ضرورت ہے جو اسے بھنوروں سے نکال کر منزل تک پہنچا دے، وہ ناخدا

جو بھی ہو۔ لیکن اب جبکہ فقیہ نے یہ کام نہ چاہا ہے اور نہ ہی کر سکا ہے، تو ہم مسافروں کی ذمہ داری کیا ہے؟ کیا ہمیں خود کو سمندر کی موجوں کے حوالے کر دینا چاہیے؟

پھر وہ کہتے ہیں: «**حکومت دینی ہونی چاہیے**»۔
اگر اس سے مراد ایسا دین ہے جو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ ہو، تو اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے؟ جب بھی آپ ریاست سے ایسے دین کا مطالبہ کریں گے، یقیناً وہ اسے قبول کرے گی؛ کیونکہ دین، حکومت کے لیے بہترین سہارا ہے، اور کون ہے جو ایسے سہارے سے دستبردار ہو؟

لیکن اگر مراد وہی دین ہے جو آج ہمارے ہاتھ میں ہے، تو صاف لفظوں میں کہنا پڑے گا کہ وہ **کاغذی آدمی** کی مانند ہے، جسے صرف شیشے کے پیچھے رکھ کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر کبھی یہ ارادہ کیا جائے کہ اسے کتابوں کے اوراق سے نکال کر سو فیصد عملی صورت میں نافذ کیا جائے، تو اسی دن **ملک اور زندگی دونوں کا فاتحہ پڑھ دینا چاہیے**۔

کہتے ہیں: «**حکومت عدل پر مبنی ہونی چاہیے**»۔ یقیناً یہ شرط کسی سے پوشیدہ نہیں، اور کوئی اس سے انکار نہیں کرتا۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ یہ صرف بہانہ ہے اور اصل مقصد کچھ اور ہی ہے۔

جہاں انسان کی وراثت، ازدواج کی احکام، حتیٰ کہ «زن جنّیہ» کے احکام متعین کیے گئے ہیں، اور جہاں مردوں کے بارے میں موت سے لے کر صور اسرافیل تک کے احکام بیان کیے گئے ہیں، وہاں حکومت جیسے بنیادی اور عام زندگی سے جڑے کام کے لیے کوئی واضح حکم مقرر نہیں کیا گیا۔

اگر ہم یہ کہہ دیتے کہ چونکہ حکومت اپنے فریضے پر عمل نہیں کرتی، اس لیے ظالم ہے یا مالیات کو ضائع خرچ کرنے کی وجہ سے حرام ہے، تو یہ ولخرجیاں اور ذمہ داریوں کی غفلت پہلے پیدا نہ ہوتی۔ ہم کہتے ہیں: اگر زمانہ غیبت میں انوشیروان عادل تخت نشیں ہو جائے تو وہ بھی ظالم ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو حکومت کے کاموں میں شریک ہو، چاہے ذمہ دار ہو یا بے ذمہ، وہ ظلم یا کفر کے مانند ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ مالیات لینا — چاہے کم ہو یا زیادہ — حرام ہے اور اسے اس طریقے سے حلال کرنا چاہیے جیسے سب جانتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو، مالیات نہ دیں، اور جب ہاتھ سے نکل جائے تو گویا ہوا میں اڑنے والا پرندہ ہے، جو جہاں چاہے جا سکتا ہے۔

چونکہ ہم یہ اصول مانتے ہیں، اس لیے ہماری حالت بھی ویسی ہی ہو جاتی ہے۔ قرآن بھی کہتا ہے اور تجربہ بھی یہ ظاہر کرتا ہے کہ: «ہر گرفتاری جو انسان کو پہنچتی ہے، وہ خود اس کی اپنی وجہ سے ہے»۔

نقصانات اس عقیدے کے (یعنی حکومت کے ساتھ عدم تعاون کے):

- لوگوں کو حکومت کے معاملے میں گھمبیر اور سرگردان کر دیا ہے۔
- ملک کی استقلال اور امن و امان کو کمزور کر دیا ہے۔
- خزانے کو بڑے نقصان پہنچائے ہیں۔
- حکومت کے کارکنان کو سست اور بدبین بنا دیا ہے۔
- اور ان تمام نقصانات کا بوجھ غریب عوام پر پڑا ہے۔

ایران میں حکومت کا کام پیچیدہ اور مبہم ہو گیا ہے:

- ایک طرف کہا جاتا ہے کہ مال و کارِ حکومت محترم ہے اور اس کے لیے قوانین و آئین نامے بنائے جاتے ہیں،
- لیکن دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ مالِ حکومت نامعلوم مالک یا بے صاحب ہے اور یہ قوانین سب بے کار اور من گھڑت ہیں۔
- ایک طرف کہا جاتا ہے کہ نظام کی خدمت لازم ہے کیونکہ اسلام نے جہاد واجب کیا ہے،
- لیکن دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ جہاد اسلام کا مطلب کچھ اور ہے اور یہ چیزیں کچھ اور

اس درمیان، عام لوگ بیچارہ اور حیران و سرگردان ہیں:

- اگر کسی ایک راستے پر چلیں تو دین کے مطابق نہیں،
- اگر دوسرے راستے پر چلیں تو دنیا کے مطابق نہیں۔
- اگر مالیات یا فوجی خدمات دیں، تو ایک گروہ کے مطابق غلط،
- اور اگر نہ دیں تو دوسرے گروہ کے مطابق خلاف۔

نتیجتاً، لوگ نہ تو ایک گروہ کے مطابق عمل کرتے ہیں، نہ دوسرے کے مطابق؛

بلکہ جو اپنا فائدہ دیکھے، اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

کیونکہ صرف وہی شخص کسی راستے پر چل سکتا ہے جو سختیوں، اونچ نیچ اور مشکلات کے باوجود ایک ثابت اور واضح مقصد کے لیے تیار ہو۔

لیکن جو خود نہیں جانتا کہ وہ کیا چاہتا ہے، اور سب سے بدتر، یہ نہ جاننا بھی نہیں جانتا، وہ ہر طرف جسے آسان تر دیکھے، اسی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

جو سپاہی ہے اور جس کے کندھوں پر ملک کی استقلال کا بوجھ ہے، یا جو محافظ ہے اور جس کے ذمہ شہر کی امن و امان ہے، وہ اس عقیدے کے ساتھ کیسے فداکاری اور جانفشانی کرے گا؟

- وہ سپاہی خانہ میں اور اخباروں میں **میہن پرستی کی باتیں** بہت سنتا ہے اور وطن پرست نغمے بھی اچھی طرح یاد رکھتا ہے،
- لیکن یہ سب اُس ایک لفظ کے سامنے جو دین کے نام پر کہا گیا ہے، **کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔**

اس نے روزناموں میں **فرض کی ادائیگی** کے بارے میں بہت پڑھا،

- لیکن جب ذاتی گفتگو میں دیکھا کہ جو بھی اس بارے میں کچھ کہتا ہے، لوگ **مسکرا کر اسے صاف اور سچا** کہتے ہیں،
- اس نے سنا کہ حکومت کا کام غلط ہے، لیکن چونکہ «اجباری» آیا، اس لیے گناہ نہیں؛ **اب دلچسپی کیوں؟**
- اس نے سنا کہ ایک زیارت کا ثواب «ہزار ہزار شہید» کے برابر ہے؛ **تو پھر جانفشانی کس لیے؟**

فداکاری اور جانبازی **ایک بہت بھاری بوجھ** ہے؛

- اور صرف وہ شخص اسے اٹھا سکتا ہے جو **ایک دل، ایک ارادہ اور ایک واضح راستہ** رکھتا ہو۔
- **کسی کے لیے جو کئی فرسخ او نچے راستوں پر محنت کر کے آیا ہے، کتنا خوشگوار ہوگا اگر کوئی کہے کہ بیہودہ خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں، بس اسی پانی اور سبزہ کے کنارے بیٹھ کر خوش رہیں۔**

- کیا ہے جو ایسے کہنے پر اپنے قدم مضبوط رکھ سکے؟

آپ قرآن سے آیت پیش کرتے ہیں کہ **سود میں کمی بیشی (تنزّلِ پول)** حرام ہے، مگر کوئی کان نہیں دھرتا؛

لیکن اگر کوئی بوڑ ھی **عورت** کہہ دے کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ **ٹیکس دینا یا فوجی خدمت انجام دینا حرام ہے**، تو خود مجھ پر—جو اس خط کا لکھنے والا ہوں—اس کا اثر ہو جاتا ہے۔

جو گاڑی **ڈھلان کی طرف** چل رہی ہو، یعنی فطرت کے میلان کے مطابق ہو، اس پر **مخالف قوت کم اثر انداز ہوتی ہے**؛
لیکن جب وہ گاڑی **چڑھائی کی طرف** جا رہی ہو، تو **ذرا سی قوت بھی بڑا اثر دکھا دیتی ہے**۔

جب کوئی سوداگر یا تاجر **ٹیکس ادا کرنا چاہتا ہے**، تو دیکھتا ہے کہ یہ **پیسہ ہے، جان نہیں** کہ آسانی سے دے دیا جائے۔
یہیں پر جیسے ہی یہ سن لیتا ہے کہ **ٹیکس دینا اعانتِ ظلم ہے**، تو خواہ اس کے دل میں پہلے کوئی دینی عقیدہ نہ بھی ہو، وہ فوراً **دین کے نام پر سوچنے لگتا ہے** اور کہتا ہے:

- وصولی کرنے والے اہلکار کو **فریب دینا چاہیے**،
- یا **رشوت دے کر** اسے راضی کر لینا چاہیے کہ یہ ٹیکس نہ لے،
- یا جتنا ممکن ہو کم لے؛

اور بسا اوقات ٹیکس کی کچھ رقم، بلکہ کبھی ساری کی ساری اسی اہلکار کو دے دیتا ہے تاکہ ریاست کے خزانے میں نہ جائے۔ اور چونکہ حکومت کے پاس پانی سے بہتا ہوا خزانہ نہیں ہوتا، وہ مجبور ہے کہ ٹیکس وصول کرے۔

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ:

- ایک طرف حکومت اپنی تنظیم اور عملہ بڑھاتی جاتی ہے،
- اور دوسری طرف عوام اپنی چالاکی اور مکاری میں اضافہ کرتے جاتے ہیں۔

اور پھر چونکہ بنیاد ہی ٹیڑھی ہے، اگر حکومت پورے ملک کے تمام لوگوں کو بھی مامور اور بازرس بنا دے، تب بھی وہ نتیجہ حاصل نہیں ہو سکتا جو ہونا چاہیے۔

سرکاری ملازم یا تو دین سے دلچسپی رکھتا ہے یا نہیں۔

- اگر نہیں رکھتا تو اس کا کوئی حساب نہیں،
- اور اگر رکھتا ہے، تو یہ عقیدہ بھی اس کے ساتھ تزریق کیا گیا ہے کہ کامِ حکومت برا ہے اور اس کا پیسہ حرام ہے؛

چنانچہ اس صورت میں وہ سب سے پہلے خود کو بدکار اور جہنمی سمجھتا ہے اور پھر کام میں داخل ہوتا ہے۔

اب ایسے شخص سے آپ کیا توقع کر سکتے ہیں مگر وہی کہ جیسے کہتے ہیں: "آب جو سر سے گزر گیا، چاہے ایک نلکے کا ہو یا سو نلکے کا"۔

مزید یہ کہ: جو چیز انسان کو دلسوزی سے کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اسے خیانت سے روکتی ہے، وہ سب سے پہلے دین ہے، اور دوسرے نمبر پر عقل و وجدان؛چنانچہ اگر یہ دونوں ساتھ ساتھ ہوں، تو اثر بہت زیادہ ہوتا ہے، اگر الگ ہوں، تو اثر کم ہوتا ہے، اور اگر یہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف ہوں، تو اثر دونوں کا خنثی ہو جاتا ہے۔

اب یہاں ہم دیکھتے ہیں:

- عقل کہتی ہے کہ حکومت کا کام اور مال دوسرے لوگوں سے مختلف نہیں، بلکہ چونکہ حکومت کا مال سب کا ہے، اس کی حفاظت زیادہ ضروری ہے؛
- لیکن ہمارا دین کہتا ہے کہ حکومت کا مال مجهول المالک ہے، اور عوام کی تشریح کے مطابق بی صاحب ہے؛

پس نتیجتاً صرف ڈر باقی رہ جاتا ہے، اور وہ بھی ہر جگہ نہیں پایا جاتا۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کا کام ملازم کی نظر میں صرف نفع شخصی بن گیا ہے، اور عوام کی نظر میں گل کی مانند خوبصورت اور سنبل کی طرح آرائش یافتہ دکھائی دیتا ہے۔

ہم جانتے ہیں ایسے لوگ جو شناختی کارڈ (تذکرہ) لینے یا زیارت جانے کے لیے رشوت دیتے ہیں، حالانکہ خود کہتے ہیں یہ مستحب ہے، اور یہ بلا شبہ حرام ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سب سے رسوا کن جھوٹ وہی لوگ قبول کرتے ہیں جن پر دین کا نام لگتا ہے، بغیر کسی چون و چرا کے، اور اس کے برعکس اپنی تمام عقل، ہمت اور فکر صرف اس پر لگاتے ہیں کہ دیکھیں قانون اور قواعد میں کس جگہ دخل اندازی یا مذاق کیا جا سکتا ہے۔

ہم بہت سے ایسے لوگ بھی جانتے ہیں جو حکومت کا مال چراتے یا خیانت کرتے ہیں، اور پھر اسی پیسے سے زیارت، روضہ یا نذر ادا کرتے ہیں۔ اسی لیے سمجھنا چاہیے کہ یہ لوگ فاسد نہیں ہیں، بلکہ وہ اچھا بننا چاہتے ہیں، مگر راستہ بھٹک گئے ہیں۔

چونکہ حکومت اور ریاست قائم کرنے کا مقصد عوام کی آسائش ہے، اور کسی بھی حکومت کا تحفظ خود عوام کے ساتھ ہے، اس لیے اس نظام میں کوئی بھی خرابی ہو، اس کا بوجھ براہِ راست عوام کے کندھوں پر پڑتا ہے۔

سب سے آخر میں ملاؤں کو بھی اس عقیدے سے بڑا نقصان پہنچا ہے؛ کیونکہ جو لوگ ان پر ایمان رکھتے ہیں، وہ چونکہ حکومت کے کام کو برا سمجھتے ہیں، اس لیے کم ہی اس کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے برعکس، زیادہ تر وہ لوگ اداری کام میں شامل ہوتے ہیں جو ان کی بات کی کوئی اہمیت نہیں دیتے یا مخالف ہیں۔ نتیجہ وہی ہوا جو ہم نے دیکھا۔

آج کے دین کے مطابق، مالیات کا پیسہ حرام ہے، اسے لینا ظلم ہے، اور اس دین کے مطابق دینے سے بھی ظلم کی مدد ہوتی ہے۔ اس کے بجائے کہا جاتا ہے کہ زکات اور خمس وصول کی جائے۔

لیکن زکات نو چیزوں سے لی جاتی ہے: سونا، چاندی (سکے والے)، گندم، جو، کھجور، کشمش، اونٹ، گائے اور بھیڑ۔

خمس تاجروں اور صنعت کاروں سے لی جا سکتی ہے، لیکن اس کا مصرف آدھا حصہ امام کا ہے، جو مجتہد کو دیا جائے۔ اور مجتہد یا تو اسے سادات کو دے، یا دوسرے ملاؤں کو دے، یا کسی امین کے پاس امانت رکھوا دے، یا اسے زمین کے نیچے محفوظ کر دے تاکہ امام زمانہ آئیں اور اسے اٹھا لیں۔ باقی آدھا حصہ سادات کا مال ہے۔

ہم نے جو کہا کہ آج کے دین کے احکام اگر کتابوں سے نکال کر عمل میں لائے جائیں تو اسی دن زندگی اور ملک کا خاتمہ ہو جائے گا، یہ بات بے جا نہیں تھی۔ ہر جماعت کی حفاظت کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ مالی قوانین درست ہوں۔

اب دیکھیں کہ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ زمین پر سب کو ہمارا تابع ہونا چاہیے، وہ اپنی یہ من گھڑت ہدایات لے کر ایک چھوٹی سی جماعت کو بھی کیسے چلائیں گے؟

اور جہاں تک زکات کا تعلق ہے، جیسا کہ ہم نے دیکھا، یہ ان چیزوں سے لی جاتی ہے جو آج کہیں موجود ہی نہیں ہیں؛ مثلاً سونا اور سکے والی چاندی (یہ واضح رہے کہ نوٹ اور انگوٹھے کی چاندی پر زکات نہیں ہے)۔
کچھ چیزیں کم ہیں، جیسے اونٹ، کھجور اور کشمش۔
اور کچھ ہر جگہ دستیاب نہیں ہیں، جیسے گائے، بھیڑ، گندم اور جو۔

تو پھر مازندران کے لوگ، جن کی زراعت چاول ہے، یا تہران اور دوسرے شہروں کے لوگ، یا صنعتی ممالک کے شہری یہ مالیات کس چیز سے دیں گے؟

اور خمس بھی آج کی زندگی کے مطابق نہیں بنتی؛ جیسا کہ آج کی اہم آمدنیوں میں سے ایک کسٹمز (گمرک) ہے، جو اس دستور کے مطابق نہیں چلتی، اور باوجود اس کے زکات سے زیادہ عملی ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں دو بڑے نقائص ہیں:

پہلا: بہت سے احادیث صحیح اور غیر صحیح میں آئی ہیں کہ امام نے خمس معاف کر دی؛ جو کچھ شاہ معاف کر دیتا ہے، شیخ علی خان کیوں نہ دے؟
میں نے ایک معتبر کتاب میں اس بارے میں سولہ حدیثیں گنی ہیں۔
تو پھر کیا ہوا کہ ایک حدیث جو کہتی ہے: "جو قم میں فاطمہ کی زیارت کرے، اسے جنت ملے" کے لیے اتنی بڑی عمارت اور تشریفات بنا دی گئی، لیکن سولہ حدیثیں صحیح و غیر صحیح کہیں بھی شمار نہیں ہوئیں؟
واہ! کیا دین داری ہے!

دوسرا: خمس کا مقصد صرف پیسہ جمع کرنا نہیں ہے، بلکہ ملک کے ضروری اخراجات پورے کرنا ہے۔
حالانکہ اس دستور کے مطابق، جیسا کہ ہم نے دیکھا، خمس کا خرچ نہ صرف ملک کے لیے فائدہ مند نہیں، بلکہ خود ایک بڑی گدا سازی کی مشین بن گئی ہے۔

آپ خود اگر بیٹے یا بیٹی رکھتے ہیں جو صحت مند اور نوجوان ہیں ، تو بھی آپ ان کا خرچ اپنے جیب سے بغیر محنت دیے نہیں دیتے، اور پھر دوسرے لوگوں کے بارے میں تو بات ہی نہیں بنتی؛ تو پھر محمد اور علی، جو خود غیرت و شجاعت کے سرچشمے ہیں، کیسے اجازت دیں گے کہ لوگ ان کے بچوں یا دوسروں کو نام نہاد دین کے بہانے مفت مال دے دیں اور اس طرح ایک بڑی جماعت کو سست اور بیکار بنا دیں؟مالی مدد دینے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نوجوان اور صحت مند لوگوں کو کام پر لگایا جائے اور ان کے محنت کے بدلے تنخواہ دی جائے۔

مفت پیسہ دینے سے ایسے لوگوں کے لیے بڑی دشمنی پیدا ہوتی ہے، نہ صرف ان کے خود کے لیے بلکہ تو وہ عوام اور ملک کے لیے بھی؛ کیونکہ اس سے وہ سست اور بیکار ہو جائیں گے، اور اگر غور کریں تو دیکھیں گے کہ اس ملک میں اتنے سارے گدا اور مفت خور پیدا ہونے کی اصل وجہ یہی بے مقصد خیرات اور احسان ہے۔

یہ بات ہنسی کے قابل ہے کہ کچھ لوگ آپس میں، یا اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کہتے ہیں:

"یورپیوں نے ہمارے قانون لے لیے اور ان پر عمل کیا، تب وہ یہاں تک پہنچے"،

یا یہ کہتے ہیں:

"اگر دنیا ہمارے یہ احکام عملی طور پر نافذ کر لے تو یوں اور ویسا ہو جائے۔"

ہاں، میں بھی اپنے کمرے میں بیٹھ کر فرض اور خیال کی دنیا میں بحرِ اوقیانوس کے اوپر ایک وسیع ملک بنا سکتا ہوں، اس میں ہزار منزلہ نہایت خوب صورت عمارتیں کھڑی کر سکتا ہوں؛ لیکن یہ سارا خیالی ملک **دو ٹوک عقلی بات** کے سامنے آتے ہی **پانی پر لکیر** بن جائے گا۔

تمہارے یہ احکام بھی اگر واقعی قابلِ عمل ہوتے، تو سب سے پہلے اپنے **مرکز میں نافذ ہو چکے ہوتے۔**
ایران میں ایسے بادشاہ کم نہ تھے جو **علما کی اجازت سے حکومت کرتے تھے**؛ پھر انھوں نے ان قیمتی جواہرات کو کیوں نہ اختیار کیا، یہاں تک کہ وہ دوسروں کے ہاتھ لگ گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب چلے گئے اور ہم پیچھے رہ گئے؟ آج بھی ہمارے حکمران، قائدین اور لکھنے والے اسی کے حامی ہیں۔

یہ نہ کہو کہ **دین کے اس اہم اصل کو عملی طور پر نافذ کریں** تاکہ نہ صرف اس کی وصولی آسان ہو جائے بلکہ لوگ **ریاست کے حرام مال** سے بھی نجات پا لیں۔

کہا جاتا ہے:

"اگر لوگ راستگو اور مخلص حکومت دیکھیں، تو خود ہی اس کے حامی بن جائیں گے، اور وہ وہی پیسے جو آج **وقف، نذر، وصیت** یا اس جیسے دیگر بہانے سے خرچ کیے جاتے ہیں، اس مقصد کے لیے دے دیں گے؛ جیسا کہ تاریخ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔"

میں کہتا ہوں: اگر عوام تربیت یافتہ اور بااخلاق ہوں، یا کم از کم اپنی فطری نیک صفات برقرار رکھے ہوں، تو ممکن ہے وہ واقعی ایسا کریں؛ لیکن ایسے لوگوں سے، جن کی دینی ہدایات وہی ہیں جو اس کتاب میں نمونہ کے طور پر دیکھیں، اس کی توقع رکھنا محال ہے۔ ایسے لوگ جو خود اور اپنے پڑوسیوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور اسی دن تاریکی میں **دستہ در دستہ زیارت پر جاتے ہیں**، کیا آپ واقعی توقع رکھتے ہیں کہ وہ ملک کے لیے فداکاری کریں؟ یہ تو محض خام خیال ہے! ہاں، خدا نے انسان میں نیکی کی حس رکھی ہے؛ اگر اسے بے فائدہ چیزوں میں استعمال کیا جائے تو وہ اسی پر مطمئن رہیں گے؛ جیسے کوئی اپنی جنسی خواہش کو ناجائز راستے پر استعمال کرے تو اسی پر اکتفا کرے گا اور جائز راستے سے منحرف رہے گا۔یہی وجہ ہے کہ ایران میں اتنے زیادہ اور گزاف پیسے وقف، نذر اور وصیت کی صورت میں دیے گئے، لیکن ان میں بہت کم ایسا ہے جو واقعی عوام کی **کسی تکلیف یا درد کو کم کرے۔**

آپ ہر جگہ عزاداری کے لیے تکیے، طلاب کے لیے مدرسے، گنبد و بارگاہیں اور اتنے سارے **اوقاف** دیکھ سکتے ہیں، لیکن ہم نے یہ کبھی نہیں سنا — اور اگر سن بھی لیا جائے تو بہت کم ہے — کہ کسی نے ایک **پل یا سڑک** بنائی ہو، یا کوئی **ہسپتال**، **دارالعجزہ** (یعنی معذوروں کا آسائش خانہ)، یا **دارالأیتام**، یا کوئی **مکتب خانہ** قائم کیا ہو، یا **طبی تعلیم**، **دوا سازی**، یا دیگر **فنون** سکھانے کے لیے کوئی مدرسہ یا ادارہ قائم کیا ہو۔

ایسے ملک میں جہاں **جندی شاپور** جیسے یونیورسٹی موجود تھے، جس کے فارغ التحصیل طلبہ بادشاہوں کے دربار کے طبیب تھے، حالات اس حد تک پہنچ گئے کہ وہاں کے طبیب یا تو یہودی بن گئے، یا وہ لوگ جو خود کو **تحفہ حکیم مؤمنی** پڑھ چکے تھے۔ شہروں میں طلاب کے لیے اتنے سارے مدرسے اور اتنے سارے اوقاف قائم ہوئے، لیکن پورے **ملک میں طب کے لیے کوئی عمارت یا وقف** ہمیں نظر نہیں آئی۔

جی ہاں، تمام خیرات میں **سقاخانے** اور آب انبار بہت زیادہ بنائے گئے، اور وہ بھی اس لیے کہ لوگ امام **حسین کی پیاسے لب یاد کریں**؛ ورنہ ایران میں ان کا اثر بھی کم نظر آتا۔ لیکن اس زمانے کے دیگر خیرات کے کام یہ تھے: **لیالی متبرکہ میں طعام تقسیم کرنا**، **سادات اور عرب**

مجردوں کی شادی کروانا، مشاہد مشرفہ کی دیکھ بھال، زیارت کی نیابت، روزہ اور نماز، علما کے ذریعے مظالم کی واپسی تاکہ "بیضہ اسلام" محفوظ رہے؛ اور سب سے بڑھ کر، خامس آل عبا کی عزاداری۔ یہی وہ خیرات و مبرات ہیں جنہیں ہمیشہ لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ پہلے لوگ ایسے اور ایسے تھے۔ ممکن ہے جو لوگ باہر بیٹھے ہیں، وہ یہ باتیں فضول سمجھیں، لیکن باقی رہنے والے آثار اور ادارہ اوقاف کا دفتر اس بات کی گواہی دیتا ہے۔

رضا شاہ کے اچھے کاموں میں سے ایک، اوقاف کی فروخت کا قانون بنانا اور اس کے پیسے کو تعلیم اور صحت کی خدمت میں استعمال کرنا تھا؛ کیونکہ آج کے دور میں وقف کا نام ہر جائیداد پر آ جائے، یہ ایک باطل داغ ہے، اور ہم نے دیکھا کہ اس کا استعمال کن کاموں میں ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے لکھاری، نمائندگان اور حکمران چونکہ دورِ جمہوریت میں دین کے حامی بن گئے، انہوں نے یہ کام روک دیا اور اس طرح دین کی بڑی خدمت کی۔

نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے لیے یقیناً ایک منتظم کی ضرورت ہے، اور یہ کام کسی ایک شخص یا خاص گروہ کا حق نہیں ہے؛ کیونکہ حکومت صرف عوام کی دیکھ بھال کے لیے ہے، لہذا وہی شخص حاکم ہو سکتا ہے جو اس کام کی ذمہ داری بہتر طریقے سے سنبھال سکے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائے، تو وہ "اولوالأمر" ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے؛ ورنہ اسے ہٹایا جائے اور ایک اہل شخص کو اس کی جگہ لایا جائے؛ جیسا کہ صدر اسلام میں وہ عوام جو خلیفہ کی اطاعت کرتے تھے، عثمان کو قتل کر دیا تھا۔

اور یہ بھی مسلّم ہے کہ حاکم چاہے کوئی بھی ہو، وہ مال جنت سے نہیں لا سکتا، بلکہ اسے یہ مال عوام سے حاصل کرنا ہوگا۔ بات یہ ہے کہ پہلے عوام کی دولت خرما اور اونٹ کی صورت میں ہوتی تھی، تو اُس سے مالیات لی جاتی تھی، اور آج بھی چونکہ دولت کارخانہ اور مشین کی صورت میں ہے، مالیات اسی سے حاصل کی جانی چاہیے۔ اور قرآن نے اگرچہ بارہا زکات کا حکم دیا، لیکن کہیں یہ نہیں بتایا کہ کس چیز سے زکات لی جائے۔

وہ تاجر جو مالیات سے بچنے کے لیے سو چالاکیاں کرتا ہے، وہ ملازم جو خود کو دیندار کہتا ہے اور پھر بھی مالِ دولت میں خیانت کرتا ہے، اور وہ سپاہی یا پولیس والا جو یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اس کا کام خدا کے نزدیک کوئی قدر نہیں رکھتا، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ عقل کے مسلّم حکم کے مطابق، جو حکم خدا کا بلا واسطہ حکم ہے، وہ گناہگار ہیں اور خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔

اے سپاہی! جان لے کہ اگر تو دشمن کے خون کا ایک قطرہ بھی بہا دے، تو عقل کے حکم کے مطابق یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ تو اپنی آنکھوں کے آنسوؤں سے حوض بھر دے۔

اے پاسبان! اگر تو ایک رات دوسروں کی حفاظت کے لیے جاگتا رہے، تو یہ اس سے کہیں بلند تر ہے کہ تو راتیں صرف ہونٹ ہلاتے ہوئے عبادت میں گزار دے۔

یہی تمہاری غیرت اور مردانگی کا سہارا ہے کہ ہر شخص کسی گوشے میں اطمینان سے سر زمین پر رکھ کر سوتا ہے۔
اور یہی تمہارے سنگین کی چمک، توپ و تفنگ کی گرج کا خوف ہے کہ فتنہ پرور لوگ اپنی جگہ دبکے بیٹھے رہتے ہیں۔

خبردار! اپنے دل میں کوئی وسوسہ نہ آنے دینا۔
اس پیٹ کو چاک کر دے جو لوٹے ہوئے مال سے بھرا ہوا ہے۔
اس ہاتھ کو توڑ ڈال جو دودھ پیتے بچوں پر بھی رحم نہ کرے۔
اس پاؤں کو کاٹ دے جو زبردستی تمہارے بھائیوں اور بہنوں کے گھروں میں داخل ہوا ہے۔

اگر تو خدا کی خوشنودی اور اس کا اجر چاہتا ہے، تو یہی اس کا راستہ ہے، نہ کہ وہ بچکانہ کام جن پر تو نے بلاوجہ دل کو خوش کر رکھا ہے۔

پانچواں موضوع: قانون

ایران میں قانون مفلوج کیوں ہو جاتا ہے؟

ہمارا آج کا دین یہ کہتا ہے:

«صرف وہی قانون سرکاری اور واجبُ الاطاعت ہے جو شریعت سے آیا ہو، اور اس کے علاوہ تمام قوانین خود ساختہ بلکہ بدعت ہیں۔»

اگر آپ ذرا سی گہرائی سے غور کریں تو اسی مقام پر اس ملک کی بدحالی کے بڑے سرچشموں میں سے ایک سامنے آ جاتا ہے؛ کیونکہ یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ شرعی قوانین خواہ کتنے ہی جامع اور کامل کیوں نہ ہوں، پھر بھی یہ ناممکن ہے کہ ہر زمانے اور ہر جگہ انسان کی تمام ضروریات کو پورا کر سکیں۔

آج ہمیں بے شمار ایسے قوانین کی ضرورت ہے، مثلاً:

رجسٹریشن (ثبت) کا قانون، بینکنگ کے قوانین، قانونِ مرورِ زمانہ، آیینِ دادرسی، بجٹ اور محاسبات کے ضوابط، کسٹم (گمرک) کے قوانین، اور اسی طرح کے سینکڑوں دیگر قوانین—

حالانکہ یہ سب شریعت سے منقول نہیں ہوئے۔

اب اگر ایک طرف ہم ان ضروری امور کے لیے قانون بنائیں، اور دوسری طرف یہ کہا جائے کہ یہ قوانین غیر سرکاری ہیں یا بدعت ہیں، تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی اوپر سے حوض میں پانی بھرے اور دوسرا نیچے سے اس کا پائپ کھول دے۔

اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ اس ملک میں، اتنے اداروں اور قوانین کے باوجود، **قانون کی کوئی وقعت نہیں رہی**؛ کیونکہ قانون اس وقت تک زندہ اور مؤثر رہتا ہے جب تک اس کی جڑیں لوگوں کے دلوں میں پیوست نہ ہوں، ورنہ وہ اس کاغذی درخت کی مانند ہے جو شکل میں تو درخت ہوتا ہے مگر ایک ہی ہوا کے جھونکے سے گر پڑتا ہے۔

میں نہیں جانتا کہ دوسرے ممالک میں قانون کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا جاتا ہے، لیکن غالباً دنیا میں کہیں بھی ایسا نہیں ہوتا کہ **قانون کی مخالفت کرنا بلکہ اس کا مذاق اڑانا، لوگ اپنی ذمہ داری اور ہوشیاری سمجھیں۔**

ایک نوجوان اپنی دو سالہ فوجی خدمت سستی اور بے غیرتی کے ساتھ گزار چکا ہے، اور اب اس کے بجائے کہ کم از کم اس قبیح فعل کو چھپائے، کھلے ماتھے اور فخر کے ساتھ اپنی بدکرداری اس سے اُس تک بیان کرتا پھرتا ہے؛ اور سننے والے بھی حوصلہ افزا ہنسی کے ساتھ کہتے ہیں:

«جی ہاں صاحب! فوجی ہونا یعنی ہر طرح بچ نکلنا۔»

دوسرا شخص، جو کسی معمولی بات پر ایک پاسبان (سپاہی/چوکیدار) کی بے ادبی کرتا ہے، اس کے بارے میں یہ کہنے کے بجائے کہ:

«تمہاری جان و مال کا امن پاسبان کے احترام سے وابستہ ہے»

یہ کہا جاتا ہے:

«حوض میں جب پانی ہی نہ ہو تو مینڈک کیا کرے؟»

(یعنی جس ملک کا کوئی مالک نہ ہو، اسے پاسبان کی کیا ضرورت؟)

تیسرا شخص رشوت دے کر کربلا کا تذکرہ (ویزہ/اجازت نامہ) حاصل کرتا ہے، اور اس سے یہ کہنے کے بجائے کہ:

«تم اس عمل سے ریاستی کارندوں کو—جو ملک کے حساس اعضا ہیں—بدعنوان بنا رہے ہو» یہ کہا جاتا ہے:

«یہ سب سیدالشہداء کے دربار میں ضائع نہیں جاتا؛ اچھا ہے کہ سارے اخراجات اسی راہ میں ہوں۔»

ایک اور شخص اپنا مال سرحد سے اسمگل کر کے لاتا ہے، اور اس کارنامے کو اس قدر فخر سے بیان کرتا ہے گویا اس نے اپنی دولت ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ہاتھ سے بچا لی ہو۔ یہ ہیں چند نمونے اس قوم کے طرزِ عمل کے، قانون اور ضابطوں کے ساتھ۔ اب آپ خود بتائیں: **ایسے درخت سے، اس پھل کے سوا اور کیا توقع کی جا سکتی ہے جو اس نے دیا ہے؟**

یہ آخر کیا سبب ہے کہ دوسرے ملکوں کا سپاہی دوسروں کی خاطر خود کو ٹینک کے نیچے اور توپ کے دہانے میں ڈال دیتا ہے، لیکن ہم میز کے پیچھے، پنکھے اور ہیٹر کے پاس بیٹھ کر بھی اپنا فرض ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے؟ کیوں دوسرے ملکوں میں اتنی وسیع اور طویل محاذوں تک باقاعدگی سے رسد اور سازوسامان پہنچایا جاتا ہے، مگر ہماری حکومت جس چیز پر بھی ہاتھ ڈالتی ہے، وہ سب کچھ اس کے ہاتھوں سے یوں پھسل جاتا ہے جیسے **لوطی غلام حسین کی قوطی** سے چیزیں نکل بھاگتی ہیں؟کیوں دوسرے ملکوں میں لاکھوں عورتیں فوجی خدمت کے لیے اپنا نام درج کرواتی ہیں، مگر ہم کام سے بچنے کے لیے رشوت دیتے ہیں؟

کیوں وہاں ایسے کام، جن کا انجام سو فی صد موت ہوتا ہے، ان کے لیے بھی اتنے زیادہ رضاکار ہوتے ہیں، لیکن یہاں کہا جاتا ہے:
«فوجی ہونا یعنی کسی نہ کسی طرح بچ نکلنا»؟

آپ کہیں گے: اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے بڑے لوگ خراب ہیں، اور چھوٹے انہی سے سیکھتے ہیں۔
یہ بات درست ہے، مگر سوال یہ ہے کہ **وہ خود کیوں خراب ہوئے؟**
اگر آپ غور کریں تو یہ ہوا بہت سے درختوں اور گھروں کے اوپر سے گزری ہے، تو پھر کیوں صرف یہی درخت یا یہی گھر گرا؟
لازماً اس نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے کہ اصل خرابی جڑ میں ہے؛ اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ خرابی کیا ہے۔

شاید آپ کہیں: اس کی وجہ یہ ہے کہ ایرانی کی سرشت ہی خراب ہے، یا اس کی تقدیر ہی ایسی لکھی گئی ہے۔
میں کہتا ہوں: تجربہ اس بات کی تردید کرتا ہے، اور قرآن بھی کہتا ہے کہ انسان کو جو مصیبت پہنچتی ہے، وہ خود اسی کے سبب ہوتی ہے۔
ہاں، ایرانی خراب ہے، **لیکن یہ خرابی اس کی فطرت میں نہیں بلکہ اس کی تربیت میں ہے۔**

میرا خیال ہے کہ اگر یہی تربیت اور یہی عقیدے کسی اور قوم میں ہوتے تو وہ کب کی مٹ چکی ہوتی؛ اور یہ بھی ایرانی ہی ہے جو ان فاسد عقیدوں کے باوجود خود کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھے ہوئے ہے۔

آپ کہتے ہیں: یہ عقیدے تو دینداروں کے ہیں، حالانکہ آج بہت سے لوگ نہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ اس کے پیغمبر پر؛ تو پھر ان باتوں کی انہیں کیا پروا ہو، جو دین کے دسویں یا بیسویں درجے میں آتی ہیں؟

میں کہتا ہوں: اوّل یہ کہ قانون سے بچ نکلنا انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے، اور — جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں — اس طرح کے کاموں کے لیے کسی بڑے محرک کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اکثر اوقات محض رکاوٹ کا نہ ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔

دوم یہ کہ ہمارے معاشرے میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ کچھ لوگ خدا اور پیغمبر سے بے تعلق ہوں، مگر ان باتوں کے پابند رہیں جنہیں انہی سے منسوب کر دیا گیا ہے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگ خدا پر ایمان نہیں رکھتے، مگر امامزادوں کے نام پر نذر مانتے ہیں؛ قیامت پر یقین نہیں رکھتے، مگر مردوں کے لیے مہینے اور سال مناتے ہیں؛ حرام راستے سے مال کماتے ہیں اور پھر زیارت کو چلے جاتے ہیں؛ شراب پیتے ہیں، مگر اگر کپڑوں پر چھینٹے پڑ جائیں تو انہیں دھو لیتے ہیں۔

ہاں، وہ قوم جس کے سامنے کوئی واضح اور روشن راستہ نہ ہو، وہ ہر طرف بھٹکتی ہے، اور کسی سمت میں مضبوطی سے کھڑی نہیں رہتی۔

سوم یہ کہ اس ملک میں نہ دیندار بہت ہیں اور نہ بے دین؛ جو لوگ نظر آتے ہیں، وہ دراصل سرگرداں انسان ہیں جو خود بھی نہیں جانتے کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ وہ دھان **پھٹکنے** والے **پنکھے** کی مانند ہیں کہ جدھر ہوا چلے، اسی طرف جھک جاتے ہیں؛ نفع کے معاملے میں سراسر مادہ پرست، اور خرافات کے معاملے میں پورے کے پورے دیندار۔

جو لوگ دین نہیں رکھتے، کم از کم ان کے دل کا صفحہ ان خرافات سے صاف ہوتا ہے؛ اور جو لوگ دین رکھتے ہیں، اگرچہ انہوں نے عقل کو پسِ پشت ڈال دیا ہے، لیکن پھر بھی کچھ دوسری اچھی اور مضبوط بنیادوں کے پابند رہتے ہیں۔ مگر ہوشیار رہو ان **شترمرغوں** سے، جن میں دونوں گروہوں کی برائیاں جمع ہو گئی ہیں اور دونوں کی خوبیاں چھوڑ دی گئی ہیں۔ فرض کیجیے آج جنگ چھڑ جائے اور آپ ان لوگوں کو جرات، ثابت قدمی اور جانفشانی پر آمادہ کرنا چاہیں؛ اگر آپ انہیں وطن کے نام پر پکاریں تو دیکھیں گے کہ یہ دینداروں کی طرح ملک اور قوم کو محض ایک فریب سمجھتے ہیں؛ اور اگر دین کے نام پر بلائیں تو معلوم ہوگا کہ اس سے بھی انہیں کوئی خاص دل چسپی نہیں۔ اور ایسا ہونا لازمی بھی ہے، کیونکہ نہ یہ لوگ آج کے دین کو سو فی صد قبول کر سکتے ہیں، نہ اسے سو فی صد ترک کر سکتے ہیں، اور نہ ہی سچ اور جھوٹ میں تمیز کر سکتے ہیں؛ چنانچہ نتیجہ وہی نکلتا ہے جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ آپ کہیں گے: یہ سب باتیں درست، لیکن ہمارے پاس ان قوانین کی اطاعت کے وجوب کی کوئی دلیل نہیں، اور ہم خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف بھی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ میں کہتا ہوں: آپ عقل سے بڑھ کر کون سی دلیل چاہتے ہیں؟ وہی عقل جو خدا کی سب سے قریبی بھیجی ہوئی دلیل ہے اور جو ہمیں خود دین تک پہنچانے والی رہنما ہے۔

ہم یہ گمان کرتے ہیں کہ دین اور زندگی کے معاملے میں ہم بالکل اندھے ہیں اور ہر چیز میں ہمیں حکم کا محتاج ہونا چاہیے؛ جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ جب آدم نے گندم کھائی تو سخت پریشانی میں پڑ گیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس مصیبت سے کیسے نکلے؛ مشرق و مغرب کی خاک چھانی مگر کوئی راستہ نظر نہ آیا، یہاں تک کہ جبرئیل آئے، اس کے سامنے بیٹھے اور اسے طریقہ سکھایا؛ آدم نے وہی کیا اور آسودہ ہو گیا۔

یہ بات درست ہے کہ انسان راستے میں رہنمائی کا محتاج ہوتا ہے؛ لیکن خدا نے ہمیں آنکھ اور عقل بھی عطا کی ہے۔ آپ اگر کسی مقصد کی طرف جانا چاہیں تو رہنما سے ایک بات پوچھتے ہیں، مگر اس سے سو گنا زیادہ اپنی آنکھوں اور راستے کی کیفیت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح ہم خدا کے راستے کو بھی تین ذریعوں سے پہچان سکتے ہیں:

اوّل: خدا کے برگزیدہ پیغمبروں کی قطعی اور مسلم باتیں، جن سے آپ بخوبی واقف ہیں؛

دوم: عقل، جسے آپ دلیل کے چار اصولوں میں شمار تو کرتے ہیں، مگر عملاً اس کو کوئی وزن نہیں دیتے۔ ہاں، یہ بات درست ہے کہ عقل ذاتی مفروضوں سے آلودہ ہو سکتی ہے، لیکن اس کا علاج بھی موجود ہے، اور وہ یہ کہ ایسے لوگ—جن کا اس معاملے میں کوئی ذاتی فائدہ وابستہ نہ ہو—اس پر فیصلہ کریں، یا اس کے لیے قانون بنایا جائے۔ مزید یہ کہ خود دین کی تعبیر بھی ان ذاتی اغراض سے عقل کے مقابلے میں کم آلودہ نہیں رہی؛

سوم: فطرت کا قانون، جسے آپ بالکل نہیں پہچانتے، حالانکہ یہی سب سے بہتر اور سب سے زیادہ واضح انداز میں ارادۂ الٰہی کو بیان کرتا ہے۔

آپ اگر کسی گھر میں داخل ہوں اور دیکھیں کہ ایک جگہ دیواریں پلستر کی ہوئی ہیں اور دوسری جگہ اینٹیں ننگی ہیں، ایک کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور دوسرے پر تالا لگا ہے، ایک کھانا میز پر تیار رکھا ہے اور دوسرا کسی کونے میں چھپا ہوا ہے—تو آپ بلا تردد سمجھ جائیں گے کہ کہاں جانا ہے، کہاں بیٹھنا ہے اور کون سا کھانا کھانا ہے۔

بالکل اسی طرح، جب ہم قدرت کے نظام اور اس کے قوانین پر نظر ڈالتے ہیں—جو خود خدا کی تخلیق ہیں—تو ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ خدا ہم سے کیا چاہتا ہے۔

جب ہم اپنے جسم پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس کے تمام مختلف اعضا کا ایک مدیر ہے جسے دماغ کہتے ہیں، جو سب کو ایک ہی مقصد کے لیے کام میں لگاتا ہے، اور وہ مقصد جسم کی بقا ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ اعضا ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کو بدل لیتے ہیں؛ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر عضو پہلے اجتماع (یعنی پورے جسم) کے لیے ہے، اس کے بعد اپنے لیے؛ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی عضو اپنی ذمہ داری ادا نہ کرے تو بیمار ہو جاتا ہے، اور کبھی یہی بیماری پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔پس ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جس طرح جسم ایک نظام ہے، اسی طرح قوم بھی جسم کے حکم میں ہے؛ اسے بھی حاکم چاہیے، فوج چاہیے، ٹیکس چاہیے اور قانون چاہیے؛ اور یہ قانون بھی ایسا ہونا چاہیے کہ ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اس میں مناسبت کے مطابق تبدیلی آ سکے۔

اور جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کا پورا نظام فطرت کے اصولوں کے مطابق چل رہا ہے، اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ان اصولوں سے ہٹ کر دعوے کرتے ہیں، ان کے ہاتھ میں باتوں کے سوا کچھ نہیں، تو ہمیں یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نہ امام حاجتیں پوری کرتا ہے، نہ امامزادہ اندھوں کو بینا کرتا ہے؛ نہ نذر، نہ روضہ اور نہ ختم کسی کو اس کی مراد تک پہنچاتا ہے؛ نہ استخارے اور رَمل کے ذریعے کوئی مستقبل کی خبر دے سکتا ہے؛ اور نہ ہی تربت اور دمِ دعا کسی بیماری کو شفا دیتے ہیں۔

اگر آپ کو اس بات پر یقین نہیں آتا، تو کہیے کہ جو کوئی ایسے دعوے رکھتا ہے، وہ چند ہوشیار اور باریک بین انسانوں کے سامنے آکر انہیں ثابت کرے، تاکہ دیکھا جائے کہ آیا خدا ان قوانین کو—جو اس نے خود اپنے ہاتھ سے قائم کیے ہیں—ان کلاہ بردار لوگوں کی خاطر بدل دے گا یا نہیں۔

مگر کیا محض باتوں سے خدا کے قانون کو بدلا جا سکتا ہے؟ یہ سب کہتے رہے کہ ٹیکس حرام ہے اور حکومت کا کام ظلم ہے، لیکن اس کے باوجود وہ اس کو روک نہ سکے؛ البتہ اسے آلودہ ضرور کر دیا۔

ہاں، ایک بڑا دریا جو زور کے ساتھ نیچے کی طرف بہہ رہا ہو، اسے مٹی ڈال کر روکا نہیں جا سکتا؛ اور اگر کوئی اس کے سامنے کھڑا ہو جائے تو وہ محض اپنی ہی مشقت ضائع کرتا ہے، البتہ اس دوران پانی کو ضرور گدلا کر دیتا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ تمام قوانین کتاب و سنت میں موجود ہیں، اور اسی بے حس بہانے سے وہ **قانونِ مطابقت** (جو فطرت کے اہم ترین قوانین میں سے ایک ہے) کے مقابل کھڑا ہونا چاہتے ہیں، تو یہ بات طے ہے کہ وہ کامیاب نہیں ہوں گے؛ ہاں، وہ قانون کو بے اثر ضرور کر سکتے ہیں۔

جو شخص یہ کہتا ہے:

«اگر پہاڑ سے چکی کا پاٹ لڑھک پڑے تو عارف وہ نہیں جو اپنی جگہ سے ہٹ جائے»

اس نے اس بات کو اپنی سستی اور مفت خوری کا بہانہ بنا لیا ہے؛ ورنہ اگر آپ اس کی طرف ایک چھوٹا سا پتھر بھی پھینک دیں تو وہ بے اختیار بھاگ کھڑا ہوگا۔ اور جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دعا کا پانی اور تربت ہر بیماری کی شفا ہے، وہ یا تو جھوٹا ہے یا نادان؛ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ خود وہی شخص جب بیمار ہوتا ہے تو، ایسے تمام دارالشفا ہونے کے باوجود، ڈاکٹر اور دوا کے پیچھے دوڑتا ہے۔ وہ حاجی صاحب دنیا کی مذمت میں سینکڑوں فارسی اور عربی اشعار اور جملے پڑھتے ہیں، مگر اسی کے ساتھ سود (نزول) بھی کھاتے ہیں، ذخیرہ اندوزی بھی کرتے ہیں اور اپنا مال دس گنا قیمت پر بیچتے ہیں؛ لیکن اگر ان سے کہا جائے کہ یہ سب کام جو آپ دین کے نام پر کرتے ہیں، زندگی کے کسی درد کا علاج نہیں، تو جواب دیتے ہیں:

”ہم دنیا کو تمہاری مادی نظر سے نہیں دیکھتے؛ دنیا تو ایک گزرگاہ ہے، اصل کام آخرت کو آباد کرنا ہے۔“

یوں وہ خود اہلِ آخرت اور روحانی ٹھہرتے ہیں، اور میں اہلِ دنیا اور مادّی قرار پاتا ہوں۔

یہی ہے خرافات کا نتیجہ، یا یوں کہیے کہ خدا کے قانون اور فطرت کے اصولوں کے مقابل کھڑے ہونے کا انجام:
نہ وہ اپنے کج راستے پر باقی رہتا ہے، اور نہ ہی خدا کے راستے پر قبول کیا جاتا ہے۔

نتیجہ یہ ہے کہ دین، **عقل اور فطرت** تینوں سچائی کے قاصد ہیں، اور یہ تینوں ایک سچے خدا کی طرف سے آئے ہیں۔ اگر یہ ہمیشہ ساتھ ساتھ نہ بھی چلیں، تب بھی کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں ہوں گے۔ قرآن خدا کی ایک کتاب ہے، لیکن کائنات اُس کی اس سے بھی بڑی کتاب ہے۔
عقل اور فطرت کی باتیں آپ براہِ راست خود اُن ہی سے سنتے ہیں، لیکن دین کی باتیں ممکن ہے سو واسطوں سے آپ تک پہنچیں، اور ہر واسطے پر کسی نہ کسی غرض یا خطا نے اس میں کچھ نہ کچھ تبدیلی کر دی ہو۔

خدا نے دین انسان کے لیے اس لیے بھیجا تھا کہ زندگی میں نادانی کے باعث جو گرہیں پڑ جاتی ہیں، انہیں کھول دے؛ نہ اس لیے کہ خود ایک نئی گرہ ڈال دے، مسئلہ در مسئلہ بڑھاتا جائے، یا تیرہ سو برس کے حاکموں اور پیشواؤں کی خواہشات اور اغراض کو دین کے نام پر تم پر مسلط کر دے۔

اگر تم کسی حکم کو دین کے نام پر دیکھو جو عقل اور زندگی کے تقاضوں سے میل نہ کھاتا ہو، تو تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں:
یا یہ کہو کہ یہ حکم دین کا نہیں ہے،
یا یہ کہو کہ خود یہ دین خدائی نہیں ہے۔

تیسری کوئی صورت نہیں۔
جس طرح اگر تمہیں کوئی لباس لا کر دیا جائے جو تمہارے جسم کے مطابق نہ ہو، تو یا تم کہو گے کہ یہ لباس میرے لیے نہیں ہے، یا یہ کہو گے کہ اسے سینے والا ناواقف تھا؛ اس کے سوا کوئی تیسری بات نہیں ہو سکتی۔

دوسرے لفظوں میں، **ہمیشہ ٹوپی سر کے مطابق لی جاتی ہے،** لیکن تم یہ چاہتے ہو کہ سر کو ٹوپی کے مطابق کاٹ دیا جائے؛ اسی لیے ہمارے دین اور ہماری زندگی کی حالت اس طرح پریشان اور درہم برہم ہو کر رہ گئی ہے۔

چھٹا موضوع: حدیث

ہمارا آج کا دین یہ کہتا ہے کہ:

„وہ تمام ذمہ داریاں جو خدا نے انسان پر عائد کی ہیں، انہی احادیث کے اندر موجود ہیں جو اس وقت ہمارے ہاتھ میں ہیں“

اور اس دعوے پر کتاب، سنت، عقل اور اجماع سے دلائل بھی پیش کیے گئے ہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان تمام دلائل کا جواب خود انہی لوگوں نے دے دیا ہے، سوائے دو دلیلوں کے، جن میں سے ایک کا جواب میں یہاں دیتا ہوں، اور اس کے بعد ان روایات کے نادرست ہونے کے اصل دلائل پیش کیے جائیں گے۔

پہلی دلیل „انسداد“ کی ہے۔

وہ کہتے ہیں: ہم جانتے ہیں کہ خدا نے ہمیں مکلف بنایا ہے، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ تکلیف انہی روایات کے اندر ہے۔ اب جبکہ ہمیں یقینی علم تک رسائی حاصل نہیں، تو ناچار ہمیں انہی روایات پر عمل کرنا ہوگا۔

اگر اس بات کو ذرا کھول کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کھلا ہوا کفر ہے؛ کیونکہ خدا نے اس زمین کی ہر چیز انسان کے لیے پیدا کی ہے، اور انسان کو حق کے راستے پر چلنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اب اگر کوئی یہ کہے

کہ خدا نے اسی راستے کے علم کا دروازہ بھی انسان پر بند کر دیا ہے، تو ایسے خدا کو آخر کیا نام دیا جا سکتا ہے؟

کیا کوئی ظالم یا کوئی پاگل ایسا کرتا ہے کہ کسی کو کسی کام پر مجبور کرے اور اس کے لیے ضروری وسائل بھی اس سے لے لے؟ یہی وہ دولت ہے جسے آپ "ظَلَمہ" کہتے ہیں، جب تک اپنا حکم کسی تک پہنچائے یا عمل کرنے کا ذریعہ اس کے حوالے نہ کرے، آپ سے کسی چیز کی توقع نہیں رکھتی؛ تو پھر کیسے بر خدای توانا و مہربان روا ہے کہ ہزاروں سال اپنے اشرف المخلوقات کو سرگردان چھوڑ دے اور اسے ان احادیث کے حوالے کر دے، جو شاید سیکڑوں یا ہزاروں سال تک لوگوں کی ناپاک کوششوں سے بنائی گئی ہیں؟ ہم قوانین طبیعت اور حکم عقل، جو سب سے واضح اور بغیر کسی واسطے کے ارادۂ الٰہی کو بیان کرتے ہیں، نظر انداز کر دیتے ہیں، اور پھر ایسے بن جاتے ہیں جیسے وہ فقیر جو اپنا لباس گھر میں چھوڑ دیتا ہے اور برہنہ سڑک پر بیٹھ کر کانپتا ہے، اور کہتے ہیں: "خدا نے علم کا دروازہ ہمارے لیے بند کر دیا ہے"؛ حالانکہ اگر کوئی اپنی فطرت اولیہ کے مطابق ہو تو ایک نظر میں سمجھ سکتا ہے کہ اگر دروازہ بند کر دیا گیا ہے، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس دروازے سے نہیں جانا چاہیے۔

دوسری دلیل جو درست ہونے کے لیے پیش کی گئی، وہ ہے سیرۃ عقلا، یعنی اگر کسی نے کسی خبر کو کسی جگہ سے سنا تو اسے قبول کر لیتا ہے

(جیسے تاریخ کے معاملے میں)؛ لہٰذا ہمیں بھی یہ احادیث قبول کرنی چاہئیں۔ یہ بات درست ہے، لیکن صرف تب تک جب تک ان کی نادرستی کا کوئی دلیل نہ ہو۔ جیسا کہ آج ہم اسی وجہ سے پیشدادیان کی تاریخ کو نہیں قبول کرتے۔ اور جیسا کہ اب تک بیان کیا گیا، ہمارے پاس ان احادیث کی نادرستی کے چھ دلائل بھی موجود ہیں، جو پہلے تفصیل سے بیان کیے گئے تھے، لیکن یہاں اختصار کے لیے فہرست کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں:

۱. بہت سی احادیث عقل کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں (ان میں سے چند مثالیں پہلے کے گفتار میں دی جا چکی ہیں)۔

۲. بہت سی احادیث علم یا بعض اوقات حسی تجربے کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں (حدیث کی مثال دیکھیں)۔

۳. بہت سی احادیث زندگی کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں (گفتار حکومت و قانون میں اس کی وضاحت دیکھیں)۔

۴. زیادہ تر احادیث آپس میں بھی ہم آہنگ نہیں ہیں (حدیث کی کتابیں ان سے بھری ہوئی ہیں)۔

۵. ہمیں معلوم ہے کہ بہت سی احادیث ساختگی ہیں (حدیث کی کتابوں میں "آیہ" کے تحت "حدیث موضوع" یا "مجعول" کی فہرست دیکھیں)۔

۶. یہ تمام احادیث ظنی ہیں، اور عقل اور قرآن کے مطابق ظن کی پیروی جائز نہیں: ﴿وَإِنَّ ٱلظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ ٱلْحَقِّ شَيْـًٔا ٢٨﴾

تین بنیادی محاذوں یا مضبوط قلعوں پر حملہ

میں بھی آپ کی طرح بہت سن چکا تھا کہ ہمارے احادیث میں بہترین علمی اور عملی ہدایات ہیں، اور یورپیوں کی وہ ترقی جو انہوں نے علم و زندگی میں حاصل کی، ہمارے احادیث سے لی گئی ہے۔ اس لیے میں نے بڑے شوق کے ساتھ کتاب‌های حدیث پڑھنا شروع کیں (اور اتفاقاً ہماری لائبریری اس حوالے سے کسی کمی سے خالی نہیں تھی)۔

ابتدائی سالوں میں، اگر کوئی حدیث ایسی دیکھتا جسے قبول کرنا میرے لیے مشکل ہوتا، تو عادت کے مطابق، میں اس نقص کو عقل کی طرف منسوب کرتا اور باقی لوگوں کی طرح کہتا:

"ہرچہ هست از قامت ناسازِبی اندام ماست
ورنہ تشریف تو بر بالای کس کوتاہ نیست"

یعنی: "نقص ہماری اپنی کمزوری کی وجہ سے ہے، نہیں تو اس کی شان کسی سے کم نہیں"۔

لیکن اس کے باوجود، اگر کوئی حدیث دیکھتا جس کا کوئی پہلو آج کے علم کے مطابق ہوتا، تو اسے جوش و نشاط کے ساتھ نوٹ کرتا (اور بعد میں اس پر ایک کتاب بھی لکھی جس کا نام ہے دین و دنیا)۔

یہ کشمکش عقل اور عادت کے درمیان اسی طرح جاری رہی، اور جب میں نے دیکھا کہ ہم اپنی وجدان کو مزید دبا نہیں سکتے، تو کہا کہ شاید ان احادیث کے اسناد کمزور ہوں۔ اس سلسلے میں بھی، جب میں نے غور کیا، تو معلوم ہوا کہ اگرچہ صحیح حدیث واقعی کم ہے (کتابِ کافی میں تقریباً 12 فیصد)، پھر بھی بہت سی احادیث صحیح ہیں۔چونکہ یہاں سے بھی مایوس ہوا، میں نے کہا شاید ان احادیث کی تأویل ہو؛ لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ تأویل بھی بالکل بےجائے کا کام ہے، کیونکہ یہ واضح ہے کہ اگر کوئی عاقل کوئی بات کہے، تو اس کا مقصد وہی ہوتا ہے جو عام لوگ اس سے سمجھتے ہیں ﴿اور ہم نے کسی رسول کو بھیجنے کے لیے ان کی قوم کی زبان کے سوا کچھ نہیں بھیجا ﴾ ()، اور اگر اس کے برعکس ہو تو زندگی کا نظام خراب ہو جائے گا، کیونکہ ممکن ہے میں اپنا گھر آپ کو رسمی سند کے ساتھ بیچ دوں اور بعد میں پچھتاؤں، اور کہوں کہ میرا مراد گھر کے درخت تھے؛ جیسا کہ یہی کام قرآن کے ساتھ کیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ بانوے قومیں سب قرآن کی طرف رجوع کرتی ہیں حالانکہ وہ سب ایک دوسرے سے دور ہیں۔اور یہی کام حدیث کے ساتھ بھی کیا گیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ ایک زمانے میں اس کی سرد تأویلات کے ذریعے اسے قدیم علوم کے مطابق سمجھایا گیا، اور جب وہ بدل گئے تو انہوں نے بھی طرزِ تأویل بدل دی (جیسے الہیات و اسلام)، جبکہ نہ وہ درست تھا اور نہ یہ۔

اسی دوران، میں ایک دوست سے ملا؛ اس نے کہا میں آقای کسروی کے پاس تھا اور انہوں نے تمہاری لکھی ہوئی کتاب "دین و دنیا" کے بارے میں تمہیں برا کہا۔ اگرچہ یہ بات میرے لیے بہت بھاری تھی، لیکن جب میں ان سے جدا ہوا تو میں نے سوچا کہ میں نے اس معاملے میں ہر طرف کوشش کی، مگر صرف بن بست ہی ملا؛ اب کیا مانع ہے کہ اصل سے دور، ان احادیث کو قلم سے ہٹا دیا جائے؟ میں نے دیکھا کہ نہ صرف کوئی مانع نہیں، بلکہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ اب، تاکہ وہ لوگ جو حقیقت کی تلاش میں ہیں، ابتدا ہی سے اس کشمکش میں نہ پھنسیں، ہم تین سنگر جو عادت کے تین اہم پناہ گاہیں ہیں، انہیں تباہ کرتے ہیں؛ یعنی مثال کے طور پر وہ احادیث پیش کرتے ہیں جو نہ صرف علم کے خلاف ہیں بلکہ حس کے بھی خلاف، تاکہ قارئین ان دیکھے ہوئے دلائل سے ان نہ دیکھے ہوئے حقائق تک پہنچ سکیں، مگر یہاں بھی اگر کہا جائے کہ خطا حس کی طرف سے ہے؛

دوسری بات یہ کہ یہ احادیث اگرچہ "بحارالانوار" کے جلد 14 سے لی گئی ہیں، لیکن ہم نے وہ احادیث نہیں لیں جو خود کتاب نے ضعیف قرار دی ہیں یا غیر معتبر کتاب سے نقل کی گئی ہیں، اور مجموعی طور پر، اگر یہ احادیث دوسروں سے زیادہ مضبوط نہ ہوں، کمزور بھی نہیں ہیں؛

تیسری بات یہ کہ آقای شہرستانی نے "الہیات و اسلام" تحریر کی تاکہ ان احادیث کی اصلاح کرے، لیکن وہ انہیں تأویل نہیں کر سکے اور جو بعض احادیث انہوں نے تأویل کیں، ان میں نصف کو شامل کیا اور باقی نصف جو ان کے مقصد کے خلاف تھیں، ان کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ اور ان سب کے باوجود، یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ عادت کے قیدی ایک کتاب پڑھ کر صدیوں کا سفر طے کر لیں گے؛ جو کچھ ہے، وہ یقینی طور پر ان کی ترقی میں ایک اہم مددگار ثابت ہوگا۔ یہ بھی عرض ہے کہ اس گفتار کی احادیث اختصار کے لیے "نقل بہ معنا" کی گئی ہیں؛ اگر کوئی لوگ مزید تفصیل سے جانچنا چاہیں تو انہیں اس کا ماخذ (بحار، جلد 14، باب 1 تا 32) دیکھنا چاہیے۔

نمونہ حدیث:

خدا کے دو شہر ہیں، ایک مشرق میں (جابُلقا) اور دوسرا مغرب میں (جابُلسا)، اور ہر ایک کے پاس ایک لوہے کی دیوار ہے، اور ہر دیوار میں ایک لاکھ دروازے ہیں، اور ان میں ستر ہزار زبانیں ہیں، جنہیں امام سب جانتا ہے اور سب پر حجت ہے؛ اور ایک اور جگہ یہ کہا گیا ہے کہ وہ لوگ نہ کوئی کام کرتے ہیں اور نہ کوئی بات کرتے ہیں، سوائے ہماری ولایت اور ان دو افراد (یعنی ابوبکر اور عمر) پر لعنت کے۔ آقای شہرستانی نے پہلے اس حدیث کو پیش کیا اور اسے امریکہ اور آسٹریلیا سے مطابقت دی، لیکن آخری حصے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

آسمانِ اوّل کا نام رفیع ہے اور وہ پانی اور دھوئیں سے بنایا گیا ہے، دوسرا آسمان سفید نقرے کا ہے اور اس کا نام قیدوم ہے، اور اسی طرح وہ گنتی کرتے ہیں یہاں تک کہ ساتویں آسمان، جس کا نام عجما ہے اور وہ سفید دفر سے بنا ہے۔ یہ ہمارا آسمان ہے اور اس کے بالاتر ایک اور آسمان ہے، اور اسی طرح گنتی کرتے ہوئے سات آسمانوں تک پہنچتے ہیں۔ اور یہ زمین ہماری زمین ہے اور اس کے نیچے ایک اور زمین ہے، یہاں تک کہ سات زمینیں شمار کی جاتی ہیں جن کے درمیان ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ جب سورج غروب کرتا ہے، تو وہ آسمانوں کی طرف جاتا ہے اور ہر آسمان سے اوپر اٹھتا ہے یہاں تک کہ عرش کے نیچے پہنچتا ہے اور وہاں سجدہ کرتا ہے اور کہتا ہے: "اے پروردگار! میں کہاں سے طلوع کروں، مغرب سے یا مشرق سے؟" پھر جبرائیل اُس کے لیے عرش کے نور کی ایک حُلہ لاتا ہے جو دن کے گھنٹوں کے برابر اونچا اور نیچا ہے، اور سورج اسے اوڑھتا ہے جیسے تم اپنی چادر اوڑھتے ہو، اور سورج آسمانوں سے لوٹ کر طلوع کے لیے واپس آتا ہے۔ جب بندگان کے گناہ بڑھ جائیں اور خدا چاہے کہ انہیں عذاب دے، تو وہ اس فلک کے فرشتہ کو حکم دیتا ہے کہ سورج یا چاند کو اُس سمندر میں ڈال دے جس میں فلک گردش کرتا ہے، اور فرشتہ اسے اس سمندر میں لے جاتا ہے، جتنا کہ خدا چاہے کہ بندگان کو ڈرائے؛ اور جب چاہے، دوبارہ حکم دیتا ہے کہ وہ فلک اپنے مدار میں واپس آجائے۔ اس

(سورج اور چاند کو قبض کرنے) سے صرف وہی نہیں ڈرتا، سوائے ہمارے شیعوں کے۔

جب خدا نے چاند پیدا کیا، اس پر لکھا: «لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللهِ عَلِيٌّ أَمِيرُ المُؤْمِنِينَ» اور یہی وہ سیاہی ہے جو تم چاند میں دیکھتے ہو۔

جمعہ کا دن دوسرے دنوں سے چھوٹا ہے، کیونکہ دوسرے دنوں میں خدا مشرکوں کی روحیں سورج کی چشمے کے نیچے رکھتا ہے اور انہیں سورج کی حرارت اور روشنی کے سامنے کھڑا کر کے سزا دیتا ہے، لیکن جمعہ کے دن خدا مشرکوں پر عذاب نہیں ڈالتا اور سورج کا رکنا نہیں ہوتا (اسی وجہ سے جمعہ کا دن چھوٹا ہو جاتا ہے)۔

ہوا کے سرد یا گرم ہونے کی وجہ مریخ اور زحل کے اثرات ہیں؛ جب مریخ اوپر جائے اور زحل نیچے آئے تو ہوا گرم ہوتی ہے، اور جب مریخ نیچے جائے اور زحل اوپر آئے تو ہوا سرد ہو جاتی ہے۔

سیارہ مشتری ایک مرد کی شکل میں زمین پر آیا اور علم نجوم ایک ہندی شخص کو سکھایا۔ کہیں اور یہ ذکر ہے کہ سیارہ زہرہ ایک بدکار عورت تھی جس نے ہاروت و ماروت کو فریب دیا اور ان سے دعا سیکھ کر پڑھا اور پھر آسمان پر چلی گئی؛ اور ایک جگہ یہ بھی ہے کہ سیارہ سہیل ایک مرد تھا، عشار، بلخ کا رہنے والا؛ اس نے وہی دعا ایک عابد سے سیکھی، پڑھی اور آسمان پر چلا گیا۔

گرج ایک فرشتے کی آواز ہے جو مچھر سے بڑا اور مکھی سے چھوٹا ہے، اور برق اسی فرشتے کا تازیانہ ہے۔

بارش عرش کے نیچے سے برستی ہے اور ایک آسمان سے دوسرے آسمان تک آتی ہے، یہاں تک کہ یہ دنیا کے آسمان تک پہنچتی ہے اور وہاں سے ابر پر گرتی ہے، اور ابر اسے اس جگہ برساتا ہے جہاں خدا چاہے۔

ہوا کعبہ کے شامی رکن کے نیچے بند ہے اور اس کی نشانی یہ ہے کہ تم دیکھتے ہو یہ رکن دن و رات، سردی و گرمی میں حرکت کرتا ہے، حالانکہ درحقیقت اس کی کوئی حرکت نہیں ہے۔

ایک فرشتہ ہے جو سمندروں پر مامور ہے اور اس کا نام رومان ہے؛ جب یہ سمندر میں اپنا پاؤں رکھتا ہے تو پانی اوپر آتا ہے (مد)، اور جب باہر نکالتا ہے تو نیچے چلا جاتا ہے (جزر)۔

خدا نے جنت سے پانچ ندیوں کو بھیجا: سیحون، جیحون، دجلہ، فرات اور نیل، اور یہ سب ایک ہی چشمے سے نکلتی ہیں؛ اور ایک اور حدیث میں کہا گیا ہے کہ جبرئیل نے اپنی انگلی سے یہ ندیاں کھودی ہیں۔

زمین ایک مچھلی کے کمر پر ہے، اور وہ مچھلی پانی پر، پانی پتھر پر، پتھر گائے کی مضبوط سینگ پر، اور گائے زمین پر ہے، اور یہاں علماء کا علم ختم ہو جاتا ہے۔ آقای شہرستانی کہتے ہیں کہ مرادیہ ہے کہ زمین مچھلی یا گائے کی

سینگ کی شکل کی ہے۔ لیکن فرض کریں زمین واقعی مچھلی یا سینگ کی شکل رکھتی ہے، باقی حدیث کا کیا ہوگا، یہ نہیں بتایا گیا (اور یہ حدیث بھی صحیح ہے)۔

وہ مچھلی جو زمین کو سنبھالے ہوئے تھی، اپنی طاقت پر خوش ہوئی؛ تو خدا نے ایک اور مچھلی بھیجی جو چھوٹی تھی مگر ایک انگوٹھے سے بڑی اور وہ اس کی ناک میں گئی اور چالیس دن بعد باہر نکلی۔ اب جب بھی پہلی مچھلی دوسری کو دیکھتی ہے تو بے چین ہو جاتی ہے اور زمین بھی اس کے ساتھ لرزنے لگتی ہے۔

یہ حدیث واضح طور پر بیان کرتی ہے کہ زمین مچھلی کے اوپر ہے؛ اب دیکھنا یہ ہے کہ آقای شہرستانی اس حدیث یا اسی حدیث کے دوسرے حصے کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

خدا نے ایک پہاڑ بنایا جو دنیا کے گرد محیط ہے (کوہ قاف) اور وہ زمرد سبز سے ہے، اور آسمان کی سبز رنگت بھی اسی سے ہے؛ اور اس نے کچھ مخلوق پیدا کی ہے جن پر لازم نہیں تھا کہ ان پر وہ فرائض (نماز، زکات وغیرہ) عائد کرے جو اس نے اپنے بندوں پر مقرر کیے ہیں، اور وہ دونوں افراد ان پر لعنت بھیجتے ہیں۔

شاید آپ کہیں کہ ہمارے پاس اس کے مقابلے میں کچھ احادیث صحیح بھی ہیں، لیکن یہ بات فرض کے طور پر بھی درست سمجھی جائے، تو ایسے

ہے جیسے کوئی شخص ایک پیالی کے ٹوٹے ہوئے نصف حصے سے کام نکالے اور کہے کہ باقی آدھا سالم ہے؛ جیسا کہ اگر آپ کسی سے ایک غلط بات سنیں تو پھر اس کے باقی کہنے پر دھیان نہیں دیتے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان احادیث کی درست ہونے کی دلیل وہ پیش گوئیاں ہیں جو حقیقت کے مطابق واقع ہوئی ہیں، اور ان کی زیادہ توجہ اس حدیث پر ہے جو بہت مشہور ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ قزوین سے ایک زندیق بر آئے گا جو وہاں کی دیواریں تباہ کرے گا اور وہاں کا پردہ (یعنی قزوین) پھاڑ دے گا اور وہاں کی خوشیاں لے جائے گا۔ اس حدیث کو بہت سی اضافیوں کے ساتھ رضا شاہ سے مطابقت دی جاتی ہے، حالانکہ یہ چند کشادہ جملے ہیں جنہیں بہت سی چیزوں سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے؛ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے، اسے ایک بار سپہسالار سے اور ایک بار سپہدار سے مطابقت دی گئی، کیونکہ ایک قزوینی تھا اور دوسرا قزوین سے آیا، اور یہ حدیث نسبتاً واضح ہے کہ یہ سب زبان زد عام ہو چکی ہے۔

لیکن باقی پیش گوئیاں یا تو ایسی ہیں جو ہر زمانے میں رہتی ہیں، جیسے یہ کہ لوگ ربا کھائیں گے، رشوت لیں گے، جھوٹ بولیں گے، زنا اور لواط کریں گے، عورتیں زین پر سوار ہوں گی وغیرہ؛ یا وہ چیزیں جو ثابت شدہ طور پر جھوٹی ہیں، جیسے احادیث سفیانی، خراسانی اور یمانی، جو کہتی ہیں یہ

سب ایک ہی دن میں واقع ہوں گے اور وہ بھی بنی عباس کی حکومت سے جڑے ہیں؛ یا وہ چیزیں جو وقوع پذیر ہونا محال ہیں، جیسے سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، عرش کے حاملوں کے آنسوؤں سے آسمان کا سرخ ہونا، سورج پر سر اور سینہ کا ظاہر ہونا، جبرائیل کا چلانا کہ حق علی کے
ساتھ ہے اور ابلیس کا چلانا کہ حق عثمان کے ساتھ ہے، یا وہ چیزیں جو آج تک واقع نہیں ہوئی ہیں۔

اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کی حقیقت سے بہتر آگاہ ہوں تو **جلد 13 بحار، فصل "علایم ظھور"** کو، جو فارسی میں بھی شائع ہوا ہے، حقیقت جوئی کے نظر سے پڑھیں تاکہ دیکھیں کہ آپ کا عقیدہ، عمل اور زندگی کس چیز پر مبنی ہے۔

13 سوالات

ہم اس لیے کہ یک طرفہ طور پر قاضی کے پاس نہ گئے ہوں، پہلے کتاب *اسرارِ ہزار سالہ* کو پندرہ سوالات میں خلاصہ کیا اور بہت سے لوگوں کو بھیجا، لیکن اکثر نے کوئی جواب نہ دیا، اور بعض نے لکھا کہ جواب دیں گے مگر بعد میں اپنے کہے سے پھر گئے، اور بعض نے لکھا کہ زبانی جواب دیں گے، مگر معلوم ہوا کہ زبانی جواب میں بھی موضوع سے ہٹ کر باتوں یا بدگوئی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس درمیان صرف *انجمن تبلیغاتِ اسلامی* نے اپنے خط نمبر 6974/4 مؤرخہ 31/2/22 میں لکھا کہ ہم ان کا جواب دیں گے اور شائع کریں گے، اور ہم نے بھی جواب دیکھنے کی امید میں اس کتاب کی اشاعت مؤخر کر دی، مگر اب تک اس کی کوئی خبر نہیں۔ اب اگر جیسا کہ انہوں نے وعدہ کیا ہے، وہ شائع ہوا تو آپ خود دیکھ لیں گے کہ معاملہ کیا ہے، اور اگر نہیں، تو پھر یہ آپ ہی پر ہے کہ اس تحریر کو آخر تک پڑھیں۔

بہرحال، یہ سوالات تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ دوبارہ یہاں پیش کیے جاتے ہیں، اور اہلِ اطلاع سے (نہ کہ دوسروں سے) درخواست ہے کہ ان کے جوابات اس پتے پر بھیجیں:

"عشرت آباد، مقابل کارپردازی لشکر ۲، خواربار فروشی رضوی"۔

اور یہ یقین رکھیں کہ اگر جواب متانت اور انصاف کے ساتھ ہوگا تو قبول بھی کیا جائے گا اور اس کی تلافی بھی ہوگی، اور اگر ہمیشہ کی عادت کے مطابق بدگوئی اور تکفیر پر مشتمل ہوگا تو اس کا جواب بھی دیا جائے گا۔

1. کیا حاجت مانگنا از پیغمبر اور امام، اور شفا مانگنا از تربت، اور اس پر سجدہ کرنا، اور یہ گنبد و بارگاہیں بنانا شرک ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو بتائیں، اور اگر نہیں تو براہ کرم پہلے شرک کی تعریف بیان کریں تاکہ ہم دیکھ سکیں کہ وہ شرک جس سے اسلام اور قرآن جنگ کرتے ہیں، ان اعمال سے کس طرح مختلف ہے۔

2. کیا ہم استخارہ یا کسی اور وسیلے سے خدا کے ساتھ رابطہ کر کے مستقبل کے نیک اور بد حالات کا علم حاصل کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہاں، تو ہمیں اس طریقے سے بڑے مالی، سیاسی اور جنگی فوائد حاصل ہونے چاہئیں اور دنیا میں سب سے آگے ہونا چاہیے، تو پھر یہ معاملہ اس کے برعکس کیوں ہے:

﴿ قُل لَّآ أَمۡلِكُ لِنَفۡسِي نَفۡعٗا وَلَا ضَرًّا إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُۚ وَلَوۡ كُنتُ أَعۡلَمُ ٱلۡغَيۡبَ لَٱسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ ٱلۡخَيۡرِ وَمَا مَسَّنِيَ ٱلسُّوٓءُ ﴾ ()

اور اگر نہیں، تو پھر آپ خدا کے نام پر اور لوگوں کی جان و مال کے ساتھ کھیل کیوں کر رہے ہیں؟

3.اگر امامت مذہب کے چار اصول میں سے چوتھا اصل ہے، اور جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں، قرآن کی زیادہ تر آیات امامت کے متعلق ہیں، تو خدا نے اس اہم اصل کو قرآن میں ایک بار بھی صریح کیوں نہیں فرمایا، تاکہ اتنے نزاع اور خونریزی نہ ہوں؟

4.ہر کام کا مزدوری اس کوشش اور اس سے حاصل ہونے والے فائدے پر منحصر ہے۔ تو یہ احادیث جو کہتی ہیں کہ کسی زیارت، عزاداری یا ان جیسی چیزوں کا ثواب ہزار پیغمبروں یا شہداء (وہ بھی بدر کے شہداء) کے برابر ہے، کیا درست ہے یا نہیں؟

5.یہ جو کہتے ہیں کہ مجتہد غیبت کے زمانے میں نایب امام ہے، کیا یہ درست ہے؟ اگر درست ہے تو اس کی حدود کیا ہیں؟ کیا حکومت اور ولایت بھی شامل ہے یا نہیں؟

6.اگر روحانی اپنے خرج کو کام یا کسی معین اور مستقل ذریعہ سے حاصل کرے تاکہ حقائق کہنے میں آزاد ہو، یہ بہتر ہے یا جیسا آج ہے کہ خرج براہ راست عوام سے لیتا ہے اور مجبور ہوتا ہے ان کے مطابق عمل کرے؟

7.یہ جو کہتے ہیں کہ حکومت ظالم ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا مقصد یہ ہے کہ حکومت جب اپنے فرض کی پیروی نہیں کرتی تو ظالم ہے، یا مقصد یہ ہے کہ حکومت مجتہد کے ہاتھ میں ہونی چاہیے؟

8.یہ جو کہتے ہیں کہ مالیات (ٹیکس) حرام ہے، اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا مقصد یہ ہے کہ عمومی طور پر مالیات نہیں لی جانی چاہیے، یا یہ کہ زکات لینی چاہیے؟ اگر دوسرا ہے، تو آج کے حالات میں، جیسے تہران یا مازندران کے شہر یا صنعتی ممالک میں، زکات کس چیز سے لیں؟

9.کیا انسان کے لیے جائز ہے کہ اپنے ملک لیے قانون وضع کرے یا نہیں؟ اگر ہے، تو ایسی قانون کی پیروی واجب ہے یا نہیں؟ اور اگر واجب ہے، تو اگر کوئی تخلف کرے تو اس کی سزا کیا ہے؟

10.یہ یقیناً ہے کہ قرآن اور حدیث میں نسخ و منسوخ بہت ہیں، اور اس تبدیلی کی وجہ وقت کے لحاظ سے رعایت ہے۔ تو جب کسی جگہ کسی محدود ماحول اور وقت میں کوئی قانون بدل جائے، کیا ممکن ہے کہ وہ دنیا کے تمام حصوں میں ہمیشہ کے لیے نہ بدلے؟ اور مزید یہ کہ جو کہتے ہیں کہ اسلام کے تمام قوانین ہمیشہ کے لیے ہیں، اگر اس کا کوئی قطعی اور واضح مدرک ہے تو براہ کرم بیان کریں۔

11.جیسا کہ کہا گیا، آج جو احادیث ہمارے پاس ہیں، وہ ظنی ہیں، اور عقل بھی اسے قبول نہیں کرتی کہ قادر و عادل خدا اپنے اشرف مخلوقات کو کسی چیز پر مجبور کرے اور علم کا دروازہ بند رکھے۔

12.بہت سی احادیث آئی ہیں جو علم، عقل، زندگی اور بعض اوقات حس کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتیں، اور اس کے باوجود ان کا سند بھی صحیح ہے، جیسے احادیث گاؤ، مچھلی، جابلقا اور جابلسا، بدا، زکات، اور جہاد۔ ان کا کیا کرنا چاہیے؟

13.آپ کے نزدیک آج کے لوگ دین سے غیر دلچسپی کیوں رکھتے ہیں؟

براہ کرم جواب لکھتے وقت ان چند نکات کو مدنظر رکھیں:

1.یہ کہ جواب موضوع سے باہر نہ ہو؛
2. جتنا ممکن ہو مختصر ہو؛
3.چونکہ دیگر لوگ بھی اس گفتگو سے آگاہ ہوں، اس لیے جواب لازمی تحریری ہو؛
4.چونکہ جو جواب دیے جا سکتے ہیں وہ خود کتاب میں بیان ہیں، اس لیے جواب لکھنے سے پہلے خود کتاب دیکھ لی جائے؛
5. اگر کسی موضوع کا جواب دیا جائے، تو باقی موضوعات پر بھی اپنی رائے دی جائے، چاہے وہ رد ہو، قبول ہو یا اطلاع نہ ہو۔

دفتر پرچم، چاپخانہ پیمان، 1322